بشیر پاشا سیریز

تذکرہ
نواب وقار الملک مرحوم

مرتبہ

محمد امین زبیری
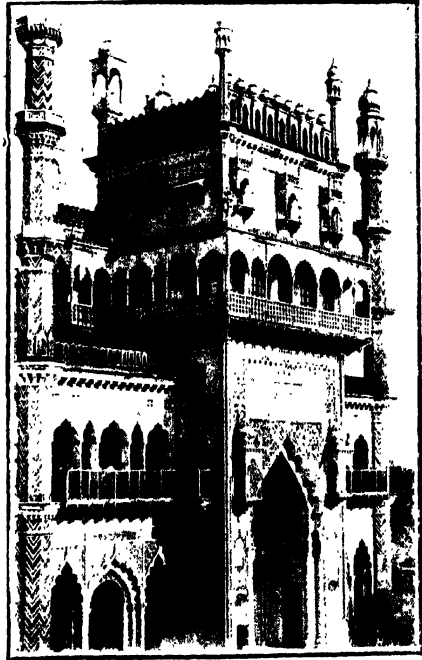
Title and inside Blocks printed by Taj Printing

٨٦

فسوف یأتی اللہ بقوم یحبہم ویحبونہ اذلۃ علی المؤمنین اعزۃ علی الکافرین یجاہدون
فی سبیل اللہ ولا یخافون لومۃ لائم

وقار الملک

باہتمام محمد احید الدین ایف آر ایس اے (لندن)

مسلم یونیورسٹی پریس علی گڈھ

فہرست مضامین

معنون

میں اس سلسلہ کو اپنے شاگرد رشید جواں مرگ بشیر پاشا مرحوم
بی اے بی ٹی کے نام سے معنون کرتا ہوں جس کی زندگی اور جس کی
تعلیم و تربیت کا مقصد قوم کی تعلیمی خدمت تھی اور جس نے تکمیلِ تعلیم کر کے
اپنی زندگی کو اسلامیہ ہائی اسکول اٹاوہ کے لئے وقف کر دیا تھا۔

محمد الطاف حسین

تذکرۃ المشاہیر

نوجوانانِ قوم میں ملک اور قوم کی خدمتوں کا جذبہ پیدا کرنے اور ان کے حوصلے بڑھانے کے لئے اُن مشاہیرِ قوم کی سوانح عمریوں کا مطالعہ جنھوں نے اپنے ملک اور اپنی قوم کی ترقیوں میں جانفشانیاں کی ہیں نہایت موثر ذریعہ ہی اور ہر ملک اور ہر قوم میں اس ذریعہ سے فائدہ اُٹھایا جاتا ہی۔ اعظم الرّجال کی بڑی بڑی سوانح عمریوں کے علاوہ خوشنما سائز اور عمدہ طباعت کے ساتھ کم قیمت لائف اسکیچ بہ کثرت شائع کئے جاتے ہیں۔

لیکن ہندوستان میں مسلمانوں نے اس ذریعہ پر کچھ توجہ نہیں کی حالانکہ دوسری قومیں اسی ذریعہ سے بہت کچھ منافع حاصل کر رہی ہیں۔

اسی مقصد کو پیش نظر رکھ کر میں نے اور مولوی بشیر الدین صاحب منیجر اسلامیہ ہائی اسکول اٹاوہ نے ارادہ کیا ہی کہ جہاں تک ممکن ہو اس عصر جدید میں جن مشاہیر نے اپنی عمریں قومی خدمت اور قومی ہمدردی میں صرف کی ہیں اُن کے لائف اسکیچ شائع کئے جائیں۔

چنانچہ اس وقت اس سلسلہ کے چند نمبر شائع کئے جاتے ہیں اور میں اُن

عزیزوں اور دوستوں کا شکر گزار ہوں جنھوں نے ہماری دلی خواہش کی تکمیل میں

اپنا وقت صرف کر کے او محنت اٹھا کر ان تذکروں کو مرتب کیا ہے خداوند تعالے

ان کو جزائے خیر دے اور ہم کو اپنے ارادہ میں کامیاب کرے

میں اپنے پُرجوش نوجوان دوست سید عبدالجلیل صاحب کا جو بمبئی

میں فن طباعت کی تکمیل کر رہے ہیں خاص طور پر شکر گزار ہوں کہ انھوں نے

نہایت تنگ وقت میں تصاویر کے ایسے اچھے اور عمدہ بلاک خود تیار کر کے

بطور امداد عنایت کئے اور اپنی نگرانی میں ان کو طبع کرایا۔

میں اپنے اہل قلم نوجوانانِ قوم سے استدعا کرتا ہوں کہ وہ اس قومی خدمت

میں ہماری مدد کر کے عند اللہ ماجور ہوں۔

اس سلسلہ کی اشاعت سے اگر کچھ فائدہ ہوا تو اسی سلسلہ کی توسیع میں صرف ہوگا۔

محمد الطاف حسین بی اے

ہیڈ ماسٹر اسلامیہ ہائی اسکول، اٹاوہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نواب وقار الدولہ وقار الملک مولوی مشتاق حسین خان بہادر انتصار جنگ

(۱)

۱۲۵۵ھ ۱۸۳۹ء میں امروہہ کے قریب ایک موضع میں نواب صاحب کی ولادت ہوئی ان کے والد شیخ فضل حسین تھے جن کا جدی سلسلہ دیوان عبدالمومن خاں سے ملتا ہے جو دربار شاہجہانی میں دیوان تن[1] کے منصب پر فائز تھے۔

نواب صاحب کنبوہوں کے اس خاندان سے تھے جو صوبہ متحدہ کے چند اضلاع میں آباد ہے[2]، اور خصوصیات و امتیازات کے لحاظ سے جس کی ایک شاندار تاریخ ہے اور اس زمانہ میں بھی تعلیمی خدمت کے لحاظ سے کچھ کم ممتاز نہیں ہے۔

---

[1] - عہد مغلیہ میں وزارت کے ہم پایہ یہ عہدہ تھا جمع خرچ سالانہ و ماہانہ عطائے جاگیرات و ترقیات مناصب کا اس سے تعلق تھا [2] - مارہرہ، میرٹھ، بریلی، امروہہ، سنبھل، اٹاوہ، لکھنؤ میں زیادہ آبادی ہے۔

نواب صاحب کی رضاعت کا زمانہ ہنوز ختم نہ ہوا تھا کہ باپ کا سایۂ عاطفت سر سے اٹھ گیا۔ اگرچہ ان کی ماں غیر تعلیم یافتہ تھیں لیکن قدیم شریف خاندانوں کی اعلیٰ تربیت کا نمونہ تھیں انھوں نے اپنے اکلوتے فرزند کی تربیت اخلاق پر بہت زیادہ توجہ رکھی اور جب وہ تعلیم کے قابل ہوئے تو ان کو مکتب میں بٹھا دیا، ریعانِ شباب تک انھوں نے فارسی اور عربی کی تکمیل کرلی۔ اس کے علاوہ کچھ دن ابتدائی سرکاری مدرسہ میں بھی تعلیم پائی۔

چونکہ سرکاری ملازمت ہمیشہ سے اس تمام خاندان کا ذریعہ افتخار تھا اس لئے ان کی توجہ بھی ملازمت کی جانب ہوئی اور جون ۱۸۵۹ء میں اسی مدرسہ میں جہاں خود تعلیم پائی تھی نائب مدرس کی عوض خدمت پر مامور ہوئے ۱۸۶۱-۱۸۶۲ء کے زمانہ قحط میں اسٹریچی صاحب[1] کلکٹر مراد آباد نے ضلع کے بڑے بڑے قصبات میں محتاج خانے قائم کئے تو امروہہ کے محتاج خانہ کا انتظام ان کے سپرد کیا گیا اور انھوں نے اس خدمت کو نہایت دلسوزی سے انجام دیا رفتہ رفتہ صدر الصدوری علی گڈھ کے سررشتہ دار اور پھر منصرم ہو گئے یہاں ایک عرصہ تک سرسید کی ماتحتی میں بھی کام کرنے کا موقع ملا وہ ہمیشہ کام میں مستعد رہتے تھے اور کبھی آج کا کام کل پر اٹھا نہ رکھتے تھے اکثر اوقات اپنے ساتھیوں کے پس ماندہ کام کو پورا کرنے میں امداد کرتے تھے دیانت و محنت اور قابلیت سے وہ تمام حکام جن سے ان کو سابقہ پڑا ہمیشہ خوش اور معترف رہے وہ ترقی پاکر سررشتہ دار کلکٹری اور نائب تحصیلدار ہوئے۔ اسی زمانہ میں میونسپلٹی کول (علی گڈھ) کی ممبری پر بھی

---

[1] لفٹنٹ گورنر صوبہ متحدہ جس کے نام سے کالج کا سنٹرل ہال موسوم ہے۔

گورنمنٹ صوبہ نے نامزد کیا اور ۱۸۷۲ء میں تحصیلداری کا امتحان دیا۔ ان دنوں کہ سرسالار جنگ اول مملکت نظام کی اصلاح کے لئے مختلف مقامات سے قابل آدمیوں کو منتخب کر رہے تھے اور سرسید کو بھی لکھا تھا کہ وہ بھی قابل آدمیوں کی سفارش کریں چنانچہ انھوں نے پہلے نواب محسن الملک کی اور پھر نواب وقارالملک کی سفارش کی آخرالذکر سفارش کرتے ہوئے لکھا کہ :-

"مشتاق حسین ذہین، محنتی، ایمان دار اور قابل حاکم ہے جس کو کافی تجربہ ہو چکا ہے۔ مختصراً یہ شخص حضور والا کی ضرورت کے لئے بالکل موزوں ہے یہ صرف فوجداری دیوانی اور حساب ہی کے صیغوں میں کام نہیں کر سکتے بلکہ ہمیشہ اس کام کے کرنے کو آمادہ ہیں جس کا حکم دیا جائے میں دعوے کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ان کا تقرر ریاست کے لئے فائدہ کا باعث ہوگا اور حضور والا کو اس وقت معلوم ہو جائیگا کہ مشتاق حسین کے متعلق میں نے جو کچھ کہا ہے اس میں مبالغہ سے کام نہیں لیا ہے۔"

۱۸۷۷ء میں جب گورکھپور اور بستی میں امداد قحط کے کام جاری ہوئے اور سرسید اس کے نگراں کئے گئے تو انھوں نے سرجان اسٹریچی سے بطور خاص درخواست کر کے نواب صاحب کی خدمات اپنی امداد کے لئے حاصل کیں اور انھوں نے سرسید کے ساتھ رہ کر نہایت جانفشانی اور ہمدردی سے کام کیا کام ختم ہونے کے بعد علیگڈھ واپس آ گئے۔
نواب صاحب ابتدا سے نماز کے سخت پابند تھے اور اوقات دفتر میں بھی کبھی ناغہ نہیں

کرتے تھے، گورکھپور سے واپسی کے بعد مسٹر کالون کلکٹر نے ایک مرتبہ ان کو روکا تو نواب صاحب نے تعمیل حکم سے صاف انکار کر دیا بالآخر استعفےٰ پیش کرنے تک نوبت پہنچی لیکن معاملہ چھ مہینہ کی رخصت پر ختم ہو گیا، اسی دوران میں حیدر آباد سے طلبی کا حکم پہنچ گیا روانگی کے وقت مسٹر کالون نے ان کے متعلق یہ ریمارک کیا کہ: میں نے چار مہینے ان کا کام دیکھا ہے اور میں ان ہی کے کام سے بالکل مطمئن ہوں۔ یہ فرائض میں چست و ذہین ہیں میں نے ان کو نماز کے لئے پابندی سے اٹھتے ہوئے پایا جس سے مجھے سخت تکلیف تھی اور میں اجازت نہیں دے سکتا تھا چونکہ وہ اپنے خیال کو تبدیل نہیں کرتے اس لئے خوش قسمتی ہے کہ دیسی ریاست میں ان کو جگہ مل گئی ہے۔

(۲)

حیدر آباد میں نواب صاحب کا ابتدائی تقرر ناظم دیوانی کی خدمت پر ہوا اور رخصت ختم ہونے پر انگریزی ملازمت سے مستعفی ہو گئے۔

نواب صاحب نے اس خدمت کے فرائض ایسی اعلیٰ قابلیت سے انجام دیئے کہ سر سالار جنگ نے ایک ہی سال بعد صدر المہام عدالت (جوڈیشل منسٹر) کی معتمدی پر ترقی دی اور معتمد عدالت نے تمام توجہ شعبہ عدالت کی اصلاح اور وضع قوانین و قواعد پر مبذول کی سب سے اول ہوا اورنگ آباد کی عدالتوں کے اقتدارات و اختیارات و تنظیم و آئین اور جیل خانجات کا معائنہ کرنے کے بعد ایک اصلاحی رپورٹ تیار کی اور پھر ۱۲۸۵ھ میں عام انتظامات

اور اصلاحات کے متعلق ایک اہم یادداشت پیش کی۔ کاغذ مہور کا اجرا کرایا جیل خانوں میں کارخانوں کے قیام پر توجہ دلائی، قیدیوں کی اخلاقی حالت کی اصلاح کے لئے واعظین کا تقرر کرایا اور اعمالِ مذہب ادا کرنے میں پوری سہولتیں بہم پہونچائیں اگرچہ ایک اعلیٰ عدالت "مجلس مرافعہ" ہائی کورٹ کے درجہ کی موجود تھی لیکن اکثر اپیلوں کی سماعت صدر المہام عدالت اور مدار المہام بھی کرتے تھے۔ یہ ایک ایسا پیچیدہ مسئلہ تھا کہ جس قدر اصلاح طلب تھا اسی قدر مدار المہام کے اختیارات کے سبب سے اس کی اصلاح کی جرأت نہ ہوتی تھی مگر نواب صاحب نے تمام اندیشوں کو نظر انداز کر کے اس کی اصلاح اور طریقہ مرافعہ کی خرابی پر نہایت قابلیت اور بے خوفی سے توجہ دلائی۔ مدار المہام نے چند دلائل کے ساتھ اس اصلاح کو مسترد کر دیا لیکن نواب صاحب مایوس و مرعوب نہ ہوئے اور انھوں نے پرزور دلائل و براہین کے ساتھ مدار المہام کے دلائل کی تردید کی اور آخر الامر اپنی اصلاح کو منظور کرا لیا اور عدالتی نظم و نسق سے متعلق جملہ تجاویز منظور کی گئیں۔ نواب سر سالار جنگ (مدار المہام) نے اپنے اختیار و اقتدار کو بالکلیہ مجلس مرافعہ کے سپرد کر دیا نظام عدالت کی ترتیب کی گئی قابل و مقنن عہدہ دار مقرر کئے گئے اور تصفیہ حقوق کا نظام مکمل ہوا۔ قواعد و قوانین کی ترتیب و تیاری کے لئے ماہرین قانون کی خدمات حاصل کی گئیں۔ صاحب بستان آصفیہ[1] لکھتے ہیں کہ:-

---

[1] - مانک راؤ وٹھل راؤ صاحب ایک متعدد کتابوں کے قابل مصنف ہیں انھوں نے کئی جلدوں میں سلطنت آصفیہ کے مکمل حالات لکھے ہیں جس میں حیدرآباد کے نظم و نسق کی بھی مفصل تاریخ درج ہے جو تمام تر مستند اور سرکاری کاغذات سے ماخوذ ہے اور یہ حصہ جوڈیشل رپورٹ ۱۳۰۹ف سے اخذ ہے۔

"مولوی مشتاق حسین (نواب انتصار جنگ بہادر) معتمد صدر المہام مقرر ہوئے ان کے زمانہ میں صیغہ عدالت کی اصلاح اور ریفارم کی تاریخ کی ایک نئی بنیاد پڑی آپ نے اپنی بے انتہا محنت اور فطرتی لیاقت سے ملک میں بہت سی ضروری اصلاحیں کیں اور عدالتوں کی طرز کارروائی بالکل بدل گئی اور آزادی حاصل ہوئی جو اس وقت تک نہ تھی۔ اُن کی ہی سفارش پر مدار المہام نے مقدمات کی نسبت اپنی مداخلت کو روکا اور حکام عدالت کی تنخواہوں میں اضافہ کیا...... اُنھوں نے عدالتہائے تحت کی نگرانی کے لئے ایک کامل انتظام جاری کیا۔"

۱۸۷۷ء کے قحط میں سلطنت آصفیہ میں کارہائے امداد قحط کے لئے ایک صدر مجلس بنائی گئی تھی۔ نواب صاحب بھی اس میں بطور ممبر شریک کئے گئے لیکن محتاج خانوں کا انتظام کلیتہً ان کے تفویض کیا گیا۔ مختلف مقامات پر یہ محتاج خانے قایم کئے گئے اور نواب صاحب نے بذات خاص مختلف اوقات پر پیہم معائنے کئے اور خود ذاتی نگرانی رکھی۔ ہر جگہ عورتوں اور مردوں کے جُدا جُدا وارڈ تھے، شیر خوار بچوں کا خاص انتظام تھا جن بچوں کی مائیں مر گئی تھیں اُن کی خدمت کے لئے عورتوں کو مقرر کیا گیا تھا، ان کے لئے دودھ کا معقول بندوبست تھا اور شیشیوں سے پلایا جاتا تھا۔ چھوٹے چھوٹے بچے جو محنت و مزدوری کے قابل نہ تھے الگ اہتمام سے رکھے جاتے تھے جن کا لباس یکساں تھا بچوں اور ضعیفوں کی تفریح کے لئے سبزہ زار بھی بنائے گئے تھے حفظان صحت اور طبّی امداد کا

کامل انتظام تھا اور اخلاقی حالت کی نگرانی بھی کی جاتی تھی نواب صاحب جب ان محتاج خانوں میں جاتے تو گھنٹوں محتاجین و مساکین اور خصوصاً بچوں کے ساتھ مصروف گفتگو رہتے کبھی وہ ایک جگہ کھڑے ہو جاتے یا بیٹھ جاتے اور سبزہ زار میں بچوں کے کھیلنے کا تماشا دیکھتے اور اس وقت ان کے دلی جذبات قطرات اشک کی صورت میں آنکھوں سے نکلتے معلوم ہوتے۔ ان محتاج خانوں میں ۹۰۰۳۶ محتاج داخل ہوئے تھے جن میں ۴۸۷۷۳ معذور محض تھے۔

جو محتاج سڑکوں وغیرہ پر کام کرنے کے قابل تھے اُن سے وہاں کام لیا جاتا تھا اور جو محتاج خانوں سے باہر جا کر کام نہیں کر سکتے تھے مگر کام کے قابل تھے ان کے لئے محتاج خانوں میں کام کا انتظام کر دیا گیا تھا۔ ان محتاج خانوں کا وقتاً فوقتاً عمدہ داران سرکار عالی کے علاوہ مدراس و بمبئی کے صوبوں اور دوسری ریاستوں کے عہدہ داروں نے معائنہ کیا اور نہایت عمدہ ریمارک کئے۔ کار ہائے قحط ختم اور محتاج خانوں کے شکست ہونے کے بعد نواب صاحب نے ایک مفصل رپورٹ صدر مجلس قحط کے سامنے پیش کی جو تقریباً سو صفحہ فلسکیپ پر ہے۔ صدر مجلس نے نواب صاحب کی ہمدردانہ کوششوں کا خاص طور پر شکریہ ادا کیا اور سر سالار جنگ نے اپنی تقریر میں کہا کہ:

"مولوی مشتاق حسین مسکین خانوں کے قائم کرنے میں تکلیف اٹھانے کے باعث حکومت کی طرف سے شکریہ کے مستحق ہیں اور ابتدا سے ہی مسکین خانوں کے عمدہ انتظام کا سبب ان کی ذات ہے۔"

اس کے بعد ۱۸۸۰ء کے کمیشن قحط کے سامنے ان کی تحریری شہادت بھی پیش ہوئی جس کے ساتھ مذکورہ بالا رپورٹ بھی منسلک تھی۔

(۳)

اس زمانہ میں اعلیٰ حضرت نظام الملک آصف جاہ سادس کی نابالغی کی وجہ سے عنانِ حکومت سر سالار جنگ اول کے ہاتھ میں تھی لیکن ان کے اور سر رچرڈ میڈ ریزیڈنٹ کے تعلقات خراب تھے اور امیر کبیر نواب رشید الدین خاں کو سالار جنگ کی مرضی کے برخلاف شریک انتظام کر دیا گیا تھا اور بقول سر اسٹوارٹ بیلی کے سی ایس آئی "سر رچرڈ میڈ کا سر سالار جنگ کے برخلاف امیر کبیر سے مل جانا بہت افسوس ناک ہوا اور گورنمنٹ ہند کو اس وجہ سے بہت سے ناگفتہ بہ کام کرنا پڑے"۔ اس حالت میں رزیڈنٹ اور وہ دونوں اس فکر میں رہتے تھے کہ شریک ریجنٹ کو جس طرح ممکن ہو اپنا ممنون وطرفدار بنا کے رکھیں۔

نواب بشیر الدولہ (سر آسمان جاہ) صدر المہام عدالت اور امیر کبیر میں جو ایک ہی خاندان کے ارکان تھے خانگی نزاعات اور حقوق و مرتبہ کے متعلق تنازعات تھے نواب بشیر الدولہ (سر آسمان جاہ) پر نواب صاحب کا خاص اثر تھا اور وہ ان پر بلے نہتا اعتماد کرتے تھے اور ان کی رائے کو نہایت وقیع جانتے تھے ان تنازعات میں سالار جنگ، نواب صاحب کے ذریعہ سے سر آسمان جاہ کو کچھ پیغامات بھیجتے اور وہی جوابات بھی

لاتے اس طرح ایک خانگی معاملہ سے اُن کا تعلق پیدا ہوگیا اسی سلسلہ میں ایک موقع پر سر سالار جنگ نے بعض مصالح کے لحاظ سے ان کو مجبور کیا کہ وہ اپنی اصلی رائے کے خلاف نواب بشیر الدولہ کے سامنے رائے ظاہر کریں لیکن انھوں نے صاف انکار کردیا جس سے سر سالار جنگ کو کسی قدر ناگواری ہوئی نواب صاحب نے اس ناگواری کو محسوس کرتے ہی اسی گھنٹہ میں استعفاء پیش کردیا اور سر سالار جنگ سے درخواست کی کہ "میں کل ہی اپنے وطن روانہ ہوجانا چاہتا ہوں" سر سالار جنگ نے درخواست ملاحظہ فرماکر فوراً ایا دکیا جب نواب صاحب سر سالار جنگ کے محل پر پہونچے تو نواب محسن الملک اور نواب مکرم الدولہ نے جہاں تک ان سے ممکن تھا نواب صاحب کو سمجھایا کہ استعفاء واپس لے لیں لیکن ان کی کوششیں بے سود رہیں پھر خود سر سالار جنگ نے اپنے سامنے بلایا اور کہا کہ "جو کچھ مولوی مہدی علی اور مکرم الدولہ نے تم سے کہا وہ انھوں نے میرا کہا ہوا نہیں کہا یہ اُن کی اپنی رائے تھی میں نے تم کو کچھ اور ہی کہنے کو بلایا ہے اور وہ یہ ہے کہ جو کچھ اُس وقت میں نے تم سے کہا وہ میری غلطی تھی مجھے کوئی حق نہیں تھا جو میں تم سے کہتا کہ جو کچھ تمہاری رائے نہ ہو اُس کو تم اپنی رائے کے طور پر بیان کرو اب میں تم سے اپنی خطا کا اعتراف کرتا ہوں" جہاں اس واقعہ سے نواب صاحب کی حقیقی دیانت وجسارت اور کیرکٹر کی مضبوطی کا اندازہ ہوتا ہے وہیں اس مدبر اعظم کے دل کی نیکی اور حقیقی قدر شناسی کا نقش بھی دل پر قایم ہو جاتا ہے اس گفتگو کا لازمی نتیجہ تھا کہ نواب صاحب استعفاء واپس لیں ان پر ایک رقت کا عالم طاری ہوگیا جس کے اثر سے خود سر سالار جنگ بھی محفوظ نہ رہ سکے اور انتہا درجہ کی محبت و نوازش اور مربیانہ شفقت کا اظہار کیا۔

مخالفین امیر کبیر کو ہمیشہ مشتعل کرتے رہتے تھے اور آخر الامر یہ بات ذہن نشین کر دی کہ مولوی مشتاق حسین ہی نواب سر آسمان جاہ کو مدد دیتے ہیں اس لئے امیر کبیر کی یہ خواہش ہوئی کہ ان کو اس خدمت سے علحدہ کر دیا جائے تاکہ نواب بشیر الدولہ کو امداد نہ مل سکے سر رچرڈ میڈ نے بھی امیر کبیر کی تائید کی لیکن سر سالار جنگ اس کو ٹالتے رہے اسی دوران میں نواب صاحب بحصول رخصت وطن آئے راستہ میں کرنل ٹونڈی ریذیڈنٹ گوالیار سے ملاقات کی جو نواب بشیر الدولہ کے خاص احباب میں تھے اور حیدر آباد میں رزیڈنٹ کے فرسٹ اسسٹنٹ رہ چکے تھے۔ اس ملاقات کی اطلاع کسی طرح امیر کبیر اور سر رچرڈ میڈ کو مل گئی اور اس سے انھیں اپنی ضد پوری کرانے کا کافی موقع مل گیا انھوں نے دوبارہ سر سالار جنگ پر تقاضا کیا اور یہاں تک زور دیا کہ آئندہ ان میں اور سر سالار جنگ میں باہم تعلقات کا دوستانہ حالت میں رہنا صرف اس برخاستگی پر منحصر ہے۔

نواب صاحب کو جب ان واقعات کی اطلاع پہنچی تو انھوں نے سر سالار جنگ کو لکھا کہ:۔

> "میں نہیں چاہتا کہ مشتاق حسین وہ شخص قرار پائے جس پر مدار المہام اور اُن کے شریک ریجنٹ کی باہم نا اتفاقی کی بنیاد قایم ہو اور ریاست کے کاروبار میں خلل آئے آپ کے تامل اس وقت شریک مدار المہام کی خواہش پوری کر دیجئے اور مجھ کو اس سے کچھ رنج نہ ہوگا بلکہ خوشی ہوگی کیونکہ میں سمجھونگا کہ یہ بھی مجھ سے اپنی سرکار کی ایک عمدہ خدمت ادا ہوئی"۔

نتیجہ میں نواب صاحب اس خدمت سے علحدہ کئے گئے اور انھوں نے علی گڑھ میں

قیام اختیار کیا اس زمانہ بیکاری میں نواب صاحب مالی مشکلات میں مبتلا ہوگئے۔ سر آسمان جاہ
نے مختلف طریقوں سے باصرار امداد کرنی چاہی لیکن نواب صاحب نے اس امداد کو قبول
کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ سر سالار جنگ کو جب ان واقعات کی اطلاع ہوئی تو انھوں
نے ایک خط میں جو کچھ لکھا اس میں ایک فقرہ یہ بھی تھا کہ "ہمہ را دیدم و خوش شدم کہ از شرفا
غیر از آنچہ از مولوی مشتاق حسین عمل شد دیگر نمی تواند شد و امید است کہ روزے بیاید کہ ایشاں
نتیجۂ عمل خود را حاصل کنند۔" ساتھ ہی جب تک کوئی دوسرا انتظام ہو چار سو روپیہ ماہانہ اپنے
پاس سے مقرر کیا مگر نواب صاحب نے اس رقم کو اپنی ضروریات سے زیادہ تصور کر کے
اس کو کم کرنے کی درخواست کی اور وہ بھی اس شرط کے ساتھ کہ یہ جو کچھ امداد ہو بطور قرض
متصور ہو لیکن اس کی نوبت نہیں آئی اور تاریخ علیحدگی سے سکریٹ سروس فنڈ سے چار سو روپیہ
ماہانہ مقرر کر دیا گیا۔ سر سالار جنگ کی ہدایت سے اس دوران میں نواب صاحب نے سررشتہ
مال کے قواعد و ضوابط کی ترتیب اور عدالت دیوانی سے صیغۂ مال کے کام کو علیحدہ کرنے کے متعلق
گشتیوں اور ہدایتوں اور مسودہ قانون مالگزاری کو مرتب کیا اور تہذیب و ترتیب دفاتر کے دستور العمل پر
نظر ثانی کی۔

ساڑھے تین برس میں بہت سے انقلابات ہوئے امیر کبیر کا انتقال ہو گیا اور سر رچرڈ میڈ
تبدیل ہو گئے۔ سر سالار جنگ نے اول ہی موقع پر نواب صاحب کو طلب کیا اور باضابطہ
حکم جاری کرنے کے بجائے اپنے قلم خاص سے حسب ذیل خط اُن کے نام بھیجا۔

عدالت پناہا! بوجوہ و اسبابے کہ رسیدن آں مہرباں برائے چندے

مناسب نبود بہ سبب شدن فیصلۂ مقدمۂ نواب بشیرالدولہ بہادر مرفوع شدہ و انتظام جدیدہ در پیش است و آں مہربان رکنِ مجلس عدالت کہ بہ طرز انتظام جدید عنقریب خواہد شد قرار خواہند یافت نظر بریں بہ خوشنودی تمام نوشتہ می شود کہ بمجرد رسیدن حکمنامہ روانہ شدہ بریں جا برسند کہ در بندوبستِ حالیہ ازاں عدالت پناہ بہ سبب تجربہ سابقہ فائدہ حاصل خواہد شد زیادہ چہ بقلم آید۔

المرقوم بست و ہفتم جمادی الاول ۱۲۹۹ھ

سالار جنگ

نواب صاحب فوراً روانہ ہوگئے لیکن بجائے رکنِ مجلس عدالت کے اپنے پہلے عہدہ پر مامور کئے گئے اور پھر چند ہی دن بعد گلبرگہ کے صدر تعلقہ دار مقرر ہوئے مگر اسی مہینہ میں سالار جنگ نے اپنا خاص معتمد عدالت و کوتوالی مقرر کرکے واپس بلا لیا اور بقول صاحب "بستان آصفیہ" نواب صاحب (سر سالار جنگ) مرحوم نے صیغہ عدالت کے ریفارم کی طرف مولوی مشتاق حسین کی معتمدی کے زمانہ میں خاص توجہ مبذول فرمائی مگر قبل اس کے کہ اس کا پورا انتظام ہو انھوں نے انتقال فرمایا۔"

(۴)

سر سالار جنگ اول کی رحلت کے ایک سال بعد اعلیٰ حضرت آصف جاہ سادس کے تخت نشین ہوتے ہی "میر لائق علی خان عماد السلطنت سالار جنگ ثانی" کے خطابات

کے ساتھ جب منصب وزارت پر فائز ہوئے تو نواب وقار الملک کا سمت شرقی کی صوبہ داری پر تبادلہ ہوا انھوں نے اس صوبہ میں خاص اور اہم اصلاحات کیں سب سے پہلا کام یہ تھا کہ مستقر صوبہ کو ورنگل کے نام سے موسوم کیا جس نام میں کہ اس کی قدیم عظمت و شہرت مضمر تھی انھوں نے زرعی آبادی کی حالت پر خاص توجہ کی ان کی ضرورتوں اور تکلیفوں کو طویل دوروں میں بالمشافہ گفتگوئیں کرکے معلوم کیا اور مناسب حال انتظامات کئے آبپاشی کے منہدم ذرایع کو درست کرنے اور جدید ذرائع مہیا کرنے پر خاص زور دیا اور گورنمنٹ سے اس غرض کے لئے دو لاکھ روپیہ کی منظوری حاصل کی اسی قریب زمانہ میں جب سر سالار جنگ ثانی نے دورہ کیا تو ان کو موقع پر تمام ضروری اور اصلاح طلب امور پر توجہ دلائی وہ نواب صاحب کے انتظامات اور تجاویز سے بہت متاثر ہوئے اور جب وہاں سے روانہ ہو رہے تھے تو ایک طولانی خط اپنے قلم خاص سے لکھا جس کا آخری جملہ یہ تھا کہ:-

"بالآخر اظہار این معنی ضروری می شمارم کہ درین دورۂ قلیل المدت آنچیکہ واقفیت از انتظام و کارگزاری آں مہربان حاصل نمودم از اں بے انتہا خورسند شدم و امید بلکہ اطمینان کامل دارم کہ سمت شرقی در ایام حکومت و نگرانی آں مہرباں رشک دیگر اسمات سرکار عالی خواہد شد۔"

نواب صاحب نے مستقر صوبہ کو از سر نو آباد کرایا ایوانِ صوبہ داری کی رفیع الشان عمارت بنوائی۔ سڑکیں، شفاخانے، مدرسے اور دیگر سرکاری مکانات تعمیر کرائے چوپڑ کا بازار تیار کرایا جو انقصار گنج کے نام سے موسوم ہے اس کے وسط میں ایک عالی شان مسجد

تعمیر کرائی۔ سرکاری طور پر ایک یتیم خانہ بھی اس اصول پر قایم کیا جب سرکار لاوارث مال کی مالک ہوتی ہے تو لاوارث بچوں کی کفالت بھی اُسی کے ذمہ ہونی چاہئیے۔" اور صدور حکم منظوری تک اس کے اخراجات خود برداشت کئے صوبہ بھر سے بیگار کا نام و نشان مٹا دیا۔ زراعت کی ترقی اور ویران مقامات اور جنگلوں کی آبادی میں کوئی دقیقہ باقی نہ رکھا؛ ورنہ صرف وہ رعایائے سرکار عالی جو علاقہ سرکار انگریزی میں آباد ہوگئی تھی پھر اپنے وطن میں واپس آگئی بلکہ سرحدی اضلاع انگریزی کی رعایا نے بھی اس صوبہ میں سکونت اختیار کرلی جس سے ۱۹۰۱ء کی مردم شماری میں بمقابلہ مردم شماری ۱۸۹۱ء کے تقریباً چار لاکھ نفوس کا اضافہ ہوگیا غرض چار سال کے اندر صوبہ ورنگل کو حسنِ انتظام کا نمونۂ کامل بنا دیا۔

ان کوششوں اور ہمدردیوں کا لازمی نتیجہ تھا کہ رعایا میں ایک عام گرویدگی پیدا ہو چنانچہ رعایا نے شہر کا صدر دروازہ ان کی یادگار کے طور پر بنایا اور اس پر ان کے نام کا ایک بڑا کتبہ نصب کیا۔

ان خدمات کے صلہ میں اعلیٰ حضرت کی پیش گاہ سے ۱۳۰۲ھ میں خانی و بہادری اور انتصار جنگ کا خطاب عطا ہوا۔

(۵)

۱۸۹۳ء میں عماد السلطنت کے استعفے کے بعد جب نواب بشیر الدولہ سر آسمان جاہ

کا وزارت پر تقرر رہا تو اعلیٰ حضرت نے بغیر کسی تحریک کے فرمان خاص کے ذریعہ سے معتمدی مالگزاری پر سرفراز فرمایا۔ اس معتمدی سے محاصل و انتظام حکومت کے اہم صیغوں کا تعلق تھا۔ نواب صاحب نے اس عہدہ کا جائزہ لیتے ہی اعلیٰ درجہ کی بیدار مغزی اور قابلیت سے اصلاحات کیں اور جو خرابیاں عرصہ سے چلی آتی تھیں آزادانہ او رانصاف اصول کے ساتھ ان کو دور کیا۔

جاگیروں اور معافیوں کی تحقیقاتوں اور صوبہ تلنگانہ کے بندوبست میں جو اس صوبہ میں پہلا بندوبست تھا جس طرح راعی کے حقوق کی حفاظت کی اسی طرح رعایا کے حقوق کی وکالت اور ان کا تحفظ بھی رکھا۔ انھوں نے بندوبست کے سلسلہ میں صاف طور پر اس اصول کو واضح کر دیا کہ:۔

"مالگزاری کا انتظام جس کی تمام تر کامیابی صرف رعایا کی مرفہ الحالی پر منحصر ہے ایک خاص قسم کا انتظام ہے اور اس لئے رعایا کے حق میں سرکار کی طرف سے کسی خاص رعایت کی پالیسی ہمیشہ ایک عمدہ سے عمدہ پالیسی سمجھی جاتی ہے۔"

پھر چند سال کے بعد وزیر کے پرسنل اسسٹنٹ کی حیثیت سے وہ حکومت کے ہر جز و کل پر حاوی ہو گئے اور اسی نسبت سے اُن کی ذمہ داریاں بڑھ گئیں۔ اُنھوں نے تمام ایسے جابرانہ دستوروں اور نذرانوں کو جو رعایا پر بار تھے یک قلم موقوف کرا دیا حتیٰ کہ محل شاہی کے باورچی خانہ کے لئے دیہات سے جو بکرے

بکریاں ڈیڑھ سو سال سے بطور نذر آتے تھے اور ریزیڈنسی سے پانوں کے آنے کا جو دستور مقرر تھا اعلیٰ حضرت سے بالمشافہ عرض کر کے ان کو بند کرایا۔

لوکل فنڈ اور لوکل بورڈ کے طریقہ کو جاری کیا اور مقامی جماعتوں کو ان کی آمدنیوں کے خرچ کا پورا اختیار دیا۔

صنعت و حرفت کی تحقیقات کے لئے ایک کمیشن قایم کئے جانے کی تجویز پیش کی اور ملکی صنعت و حرفت کی سرپرستی کے لئے دفاتر سرکاری میں ملکی مصنوعات کے استعمال کی خاص ہدایت کی اور ملکی مصنوعات کی نمایشوں کی بنیاد ڈالی۔

یونانی شفاخانے اوّل بلدہ میں اور پھر مفصلات میں قایم کئے گئے اور طبی تعلیم کے لئے ایک مدرسہ طبیہ بھی جاری ہوا۔

ملازمت سرکار عالی میں ملکی لوگوں کے حقوق محفوظ کئے اور جو ملازم کہ اصلی وجوہ یا ہیر پھیر کے طریقوں سے تخفیف ہو گئے تھے ان کی پریشان حالت پر وزارت کو خاص توجہ دلائی۔ جو ناقابل خدمت تھے اُن کو وظیفہ و انعام دیا گیا اور جو کام کرنے اور خدمت کے قابل تھے اُن سب کو قابلیت کے لحاظ سے مقرر کرایا اور جب تک تمام تخفیف یافتہ مقرر نہ ہو گئے کوئی جدید تقرر عمل میں نہ آیا اور تاریخ تخفیف سے تاریخ ملازمت تک ان کو تنخواہیں ملتی رہیں۔ ماتحت ملازموں سے اعلیٰ عہدہ داروں تک کے مدارج مشاہرات اور ترقیوں کے اصول مقرر کئے۔ انھیں کی تجویز سے پردہ نشین خواتین کی قلم بندی بیانات کے لئے ایک زنانہ کمشنر کا تقرر عمل میں آیا۔

ملکی انتظامات کے علاوہ ان پولٹیکل معاملات میں بھی جن کا تعلق امپیریل گورنمنٹ سے تھا کامل دوراندیشی، تدبر اور آقا کی وفاداری کے ساتھ اپنے فرائض انجام دیئے۔

ان پولٹیکل کاموں میں نہایت اہم کام اجارۂ معدنیات کی تنسیخ کا تھا جو چند سال قبل رزیڈنسی اور گورنمنٹ آف انڈیا کے مشورہ سے لندن کے اجارہ داروں کے ساتھ مکمل ہوا تھا۔

اس اجارہ سے گورنمنٹ نظام کے فوائد کو سخت نقصان پہنچا تھا۔ نواب صاحب نے ایک تنقیح کے سلسلہ میں اس معاہدہ پر غور کیا اور اپنے شکوک و شبہات ظاہر کئے تو نواب محسن الملک نے ان چالاکیوں کا جو لندن میں کی گئی تھیں لندن کے ایک ماہر مالیات کی مدد سے انکشاف کرلیا۔ یہ معاملات اس زور و شور کے ساتھ پبلک میں آئے کہ اس کی تحقیقات کے لئے ایک پارلیمنٹری کمیٹی قایم ہوئی اور بالآخر ایک دوسرا صاف اور صریح معاہدہ عمل میں آیا جس سے اعلیٰ حضرت کی گورنمنٹ کے حقوق محفوظ ہوگئے اور جو نقصان پہنچا تھا اس کی بھی ایک حد تک تلافی ہوگئی۔ اس معاملہ کے متعلق نواب صاحب پر بڑی اہم ذمہ داری تھی اور جس قدر وہ اہم تھی اُسی اہمیت کے ساتھ اُنھوں نے انجام دیا۔ لندن کی کارروائیوں کی نگرانی، پالیسی کا قایم کرنا، پارلیمنٹ کی رپورٹ کے بعد اپنی گورنمنٹ کی طرف سے یادداشت کی تیاری، گورنمنٹ آف انڈیا کے سکرٹریوں سے بحث و مباحثہ اور بالآخر اس پیچیدہ مسئلہ کو بغیر کسی اخلاقی و مادی نقصان کے سلجھا لینا ان کا ایک زبردست کارنامہ ہے۔

اُنھوں نے استرداد برار کا سوال پیش کرنے میں بھی محنتِ شاقہ کی تھی اور ایک زبردست اور مبسوط یادداشت بھی تیار کر لی تھی لیکن اس کے باضابطہ پیش ہونے سے پہلے ہی ان کا زمانہ ختم ہو گیا اور اُن کی کوشش اسی حد تک رہ گئی۔

غرض اس دور میں جس قدر اہم پولٹیکل معاملات انجام پذیر ہوئے ان سب میں نواب صاحب کی قابلیت و سرگرمی بطور جزوِ اعظم شامل رہی۔ اُنھوں نے اپنے تمام دوران ملازمت میں پوری قابلیت، کامل مردم شناسی اور انتہائی محنت کے ساتھ اپنی خدمات انجام دیں جن کا نقش ہر شخص کے دل پر مرتسم تھا اور جس کو جتنا زیادہ قریبی واسطہ تھا اسی قدر اس کے دل میں نواب صاحب کے ان اوصاف کی عظمت کا گہرا اثر تھا۔

نواب سرفریدون الدولہ فریدون جنگ بہادر کے سی ایس آئی جنھوں نے عرصہ تک ان کے ساتھ کام کیا ہے اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں کہ:-

"میرے دل میں ان کی بہت بڑی عظمت و وقعت تھی، وہ جفاکش ضمیر کے پابند اور نہایت ایمان دار عہدہ دار تھے۔ اُن میں قوت عمل اعلیٰ درجہ کی تھی اور ہندرہ سولہ گھنٹے روزانہ کام کرنے کو کچھ نہیں سمجھتے تھے"

نواب صاحب نے ان عام مشکلات کی وجہ سے جو عموماً انگریزوں کو اعلیٰ عہدوں پر مقرر کرنے سے رونما ہوتی ہیں انگریزوں کا کثیر تعداد میں اعلیٰ عہدوں پر تقرر پسند نہیں کرتے تھے لیکن جو عہدہ دار مامور تھے یا معمور کئے جاتے اُن کے ساتھ دوستانہ تعلقات رکھتے تھے مسٹر ٹرنلاپ سی آئی ای جو بعد کو معتمد مالگذاری ہوئے عرصہ تک ان کے ماتحت رہ چکے

تھے، نواب صاحب کے کیرکٹر اور اپنے تعلقات کی نسبت کہتے ہیں کہ :-

" وہ نہایت جفاکش، اعلیٰ اصول کے بے حد پابند، ایماندار، رعایا کے ہمدرد اور ریاست کے ایک قابل قدر ملازم تھے، ان کے ساتھ میرے تعلقات ۱۹۰۸ء سے شروع ہوئے تھے اور ان کی واپسی کے وقت تک جو خوش اسلوبی کے ساتھ عمل میں آئی قایم رہے۔ اگرچہ وہ ہمیشہ انتظامی تجاویز کو میرے نقطۂ خیال سے نہیں دیکھتے تھے لیکن اس اختلاف رائے سے میرے دوستانہ تعلقات میں کبھی فرق نہیں آیا۔ وہ ہر وقت کل تجاویز کے موافق و مخالف دلائل سننے کے لئے تیار رہتے تھے اور معقول دلائل تسلیم کر لیتے تھے۔"

اس دور میں نواب صاحب کا اپنے فرائض کے لحاظ سے رزیڈنسی سے بہت گہرا تعلق تھا اور نواب صاحب جیسی طبیعت مرتبہ اور کریکٹر کے عہدہ دار کو ایسے مواقع پر جب کہ اغراض و حقوق ملکی میں کوئی تصادم واقع ہو یا امپیریل پالیسی سے کوئی اختلاف کرنا پڑے یا خود رزیڈنٹ پر پارٹی فیلنگ کا کوئی اثر ہو جائے سخت مشکلات کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے اور نواب صاحب کو بھی ایسے موقعے اور اتفاق پیش آئے لیکن انھوں نے ہمیشہ اپنے فرائض کو آزادی سے انجام دیا اور اپنے حقوق و عذرات کو واقعات و دلائل سے مضبوط کر کے پیش کیا۔ ریاست کے اندرونی معاملات میں حتی الامکان رزیڈنسی کی مداخلت کو جو رجنسی کے زمانہ سے قایم تھی کم کرنے کی کوشش کی اور اس کوشش میں ایک

رزیڈنٹ مسٹر ہاول کے ساتھ سخت تصادم بھی واقع ہوا لیکن امپیریل گورنمنٹ کی طرف سے مداخلت دور کرنے میں تائید ہی حاصل ہوئی۔

انھوں نے اپنے ذاتی مفاد کے لئے کبھی رزیڈنسی کا سہارا نہیں ڈھونڈا اور اسی قدر واسطہ رکھا جو مفاد ملکی کے لحاظ سے ایک عہدہ دار کے لئے ضروری ہے ساتھ ہی رزیڈنسی کے مرتبہ اور اس کی عظمت وقوت کو بھی ہر موقع پر ملحوظ رکھا اور مختلف فیہ مسائل کے طے کرانے میں ایک صاف اور ایماندارانہ اصول کی پیروی کی۔

اس پالیسی اور طرز عمل کا نتیجہ تھا کہ خواہ کسی رزیڈنٹ سے کیسا ہی اختلاف رائے ہو لیکن اس کے دل میں نواب صاحب کی عزت اور اعلیٰ کریکٹر کا گہرا نقش قایم ہوتا تھا۔

سر ڈنیس فٹز پیٹرک نے جو ایک عرصہ تک حیدرآباد میں رزیڈنٹ رہے تھے اور بعد کو پنجاب کے لفٹننٹ گورنر ہوئے سر چارلس کرا سویٹ لفٹننٹ گورنر ممالک متحدہ کو نواب صاحب کے تعارف میں جو طولانی خط لکھا ہے اس میں لکھتے ہیں کہ

"میں مشتاق حسین کے کریکٹر کو جب تک میں حیدرآباد میں رہا ہر طرح قابل تعریف سمجھتا رہا میں نے ان کے بدترین دشمن کو اس کے سوا اور کچھ کہتے نہیں سنا کہ ان کا دامن برائی سے بالکل پاک ہے اس ملک کے لوگوں میں جن سے مجھے واسطہ پڑا ہے وہ سب سے زیادہ کامل ایماندار اور کفایت شعار ہیں اور ان کی وہ دانائی جو انھوں نے وزیر اور نظام کو

رزیڈنٹ کے تعلقات درست رکھنے میں کی ہے تمام تعریفوں سے مستغنی ہے"

ان کو اکثر و بیشتر مواقع اعلیٰ حضرت کی پیشی میں بالمشافہ کاغذات پیش کرنے کے ملتے تھے اور اعلیٰ حضرت الطاف شاہانہ سے پیش آتے تھے مگر کبھی اپنے مفاد ذاتی کے لئے کوشش نہیں کی بلکہ ان موقعوں پر مخلوق خدا کی فائدہ رسانی ملحوظ رکھی۔

اعلیٰ حضرت نے نواب صاحب کی ان خدمات جلیلہ کی قدر شناسی میں ۱۳۰۹ھ ۱۸۹۱ء میں وقار الدولہ وقار الملک کا خطاب عطا فرمایا اور فتح میدان کے قریب ایک عالی شان مکان بھی مرحمت کیا۔

(۶)

اس اہم اعتماد کی وجہ سے جو نواب سر آسمان جاہ کو نواب صاحب پر تھا اور جو روز افزوں اقتدار ان کو مملکت نظام میں حاصل ہو رہا تھا اُن کے حاسدوں اور خود غرض اشخاص کے لئے جن میں بعض بڑے عہدہ دار اور رسوخ یافتہ اشخاص بھی شامل تھے سوہان روح بن گیا تھا۔ اس لئے وہ مختلف طریقوں سے نواب صاحب کے خلاف خراب شہرتیں پھیلانے لگے اور اپنی حاسدانہ تجاویز کا ایک منظم سلسلہ قایم کر لیا، لیکن نواب صاحب نے ان باتوں کو ہمیشہ نظر حقارت سے دیکھا مگر چونکہ بعض انتظامی امور میں بھی مشکلات رونما ہونے لگی تھیں اس لئے نواب صاحب نے سبکدوش ہونا ہی مناسب سمجھا او جنوری ۱۸۹۱ء میں وظیفہ کی درخواست پیش کر دی اور اس کی

منظوری پر اصرار کیا۔

مگر نواب سر آسمان جاہ نے درخواست نامنظور کی البتہ ان مشکلات انتظامی کو دور کرنے کی جو تجاویز کہ نواب صاحب نے پیش کی تھیں سب منظور کرلیں۔

لیکن حساد اور وہ لوگ جو نواب صاحب کے زوال میں اپنا عروج سمجھتے تھے نہایت مستعدی اور تنظیم کے ساتھ اپنی کوششوں میں منہمک تھے اور رزیڈنٹ وقت سر چارلی پلوڈن پر بھی انھوں نے اپنا اثر قایم کرکے ان کی پشت پناہی اور حمایت حاصل کرلی تھی ان میں سے کچھ لوگ جن کو اعلی حضرت کی پیشی میں حاضر رہنے کا زیادہ اتفاق رہتا تھا نواب صاحب پر ایسے الزامات منسوب کرتے رہتے تھے کہ جس سے خاطر اقدس برگشتہ ہو جائے اور دوسروں کے قصوروں اور غلط کارروائیوں اور خراب مشورں کو ان کے ذمہ عاید کرکے بدخواہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے رہتے تھے ان کارروائیوں کا مقابلہ بغیر اس کے ناممکن تھا کہ نواب صاحب بھی اپنے گرد و پیش پارٹیاں بنائیں اور جو وقت کہ خدمتِ ملک میں گزرنا چاہئے اور جو طاقت اپنے مالک اور آقا کے اغراض ادا کرنے میں صرف ہونی چاہئے اس کو سازشوں کے درہم و برہم کرنے اور مقابلہ و مدافعہ میں گزاریں اور یہ باتیں ان کی ضمیر اور اخلاق کے خلاف تھیں اس لئے وہ اکثر و بیشتر متردد رہتے تھے اور اعلی حضرت اور مدار المہام کے الطاف و عنایات کا کوئی اثر ان کی طمانیت خاطر پر نہ تھا اسی دوران میں نواب صاحب کی عدم موجودگی میں ایک موقع پر اعلی حضرت نے اثنائے گفتگو میں ایک ایسا جملہ ارشاد فرمایا

جس کو نواب صاحب نے سن کر اپنی نسبت ناراضی کا اشارہ تصور کیا اس بنا پر
انھوں نے فوراً وظیفہ کی درخواست پیش کر دی اور اس کو نواب سر آسمان جاہ نے
اصرار کے ساتھ منظوری کے لئے اعلیٰ حضرت کی پیشی میں بھجوایا۔ اعلیٰ حضرت نے بہت دن
تک اس پر کوئی حکم صادر نہیں کیا لیکن ادھر نواب صاحب کا اصرار تھا اور ادھر دشمن
اپنی تدابیر میں مصروف تھے بالآخر درخواست منظور ہوئی اور معینہ مقدار سے بیشتر
زاید وظیفہ مقرر کیا گیا اور اکتوبر ۱۸۹۲ء میں ۱۷ برس مملکت آصفیہ کی خدمات ادا کرنے
کے بعد حیدرآباد سے واپس ہوئے۔

(۷)

۱۸۶۰ء میں نواب صاحب کے ماموں اور خسر ڈپٹی امام الدین صاحب مرادآباد
میں سر سید کے ساتھ انتظام قحط میں شریک تھے اور ان دونوں میں دوستانہ تعلقات
تھے سر سید کے خیالات سے ان کو پوری ہمدردی تھی اور اسی وجہ سے وہ سینٹفک
سوسائٹی کے ممبر بھی ہو گئے تھے نواب صاحب بھی اس زمانہ میں وہیں مقیم تھے اور
اکثر سر سید کی خدمت میں حاضر ہوتے اور ان کے فیضِ صحبت سے استفادہ کرتے اور
اس طرح گویا ان تعلقات کی بنیاد پڑی جس پر نواب صاحب کی قومی خدمات کی عظیم الشان
عمارت تعمیر ہوئی۔

نواب صاحب جب علیگڑھ تبدیل ہو کر آئے تو سر سید کے قومی کاموں میں بطوع

ایک خادم کے شریک ہوئے دل میں ہمدردی کا جو کامل ولولہ او رصادق جذبہ قدرت نے ودیعت کیا تھا اب وہ ظاہر ہونے لگا ہر ایک کام جو سرسید ان کے تفویض کرتے نہایت محنت اور دلچسپی سے انجام دیتے۔ سوسائٹی اور پریس کا اہتمام اور تہذیب الاخلاق کی اشاعت کا انتظام اُن کے ذمہ تھا جنوری ۱۸۶۶ء میں وہ سینٹفک سوسائٹی کے ممبر منتخب ہوئے اور پھر آٹھ سال بعد معاون کا رتبہ حاصل ہوا ۱۸۶۸ء میں اُن کی تعلیمی سرگرمیوں نے ایک مدرسہ موسوم بہ "مفید خلایق" کی بنیاد ڈالی اور ۱۸۶۹ء میں وہ لوکل سررشتہ تعلیم کے ممبر ہوئے وہ ضلع کے مدارس کا وقتاً فوقتاً معائنہ کرتے اور طلباء کا بذات خاص امتحان لیتے۔ انھوں نے اصلاح حالات کے لئے ایسی زبردست یادداشتیں تحریر کیں کہ سررشتہ تعلیم میں گھبراہٹ پیدا ہو گئی۔

تہذیب الاخلاق کے سرگرم مضمون نگار بھی تھے اور ان کا رجحان زیادہ تر اصلاح تمدن کی جانب تھا اگرچہ وہ ایک متشدد مسلمان تھے اور مذہب کے متعلق سرسید کی صحبت اور خیالات سے انھوں نے کوئی اثر قبول نہیں کیا تھا تاہم جو غلاف حقیقی اور اصلی مذہب پر ڈال دیا گیا تھا اُس کے آثار پھینکنے کی کوشش میں وہ ضرور شریک تھے اور جسارت کے ساتھ اظہار خیالات کرتے رہتے تھے۔ اُن کے دل میں قومی لگن تھی اور وہ قومی ہمدردی کے جذبات سے معمور تھا لیکن نجات اُخروی کے لئے وہ اعمال و احکام مذہب کی پابندی بھی ضروری تصوّر کرتے تھے چنانچہ تہذیب الاخلاق کے ایک مضمون میں ان خیالات کو نہایت لطیف پیرایہ میں ظاہر کیا ہے۔ بااین ہمہ وہ سرسید اور نواب محسن الملک کے ساتھ

الحاد و زندقہ کے الزاموں اور تہمتوں سے نہ بچے۔

۱۸۷۲ء میں سرسید نے جب کمیٹی خواستگار تعلیم مسلمانان کی جانب سے ایک جواب مضمون کا اشتہار شائع کیا جس کا مقصد یہ تھا کہ ان وجوہ کو معلوم کیا جائے کہ مسلمان سرکاری مدارس میں کیوں داخل نہیں ہوتے، ان میں علوم جدیدہ کی تعلیم کیوں نہیں پھیلتی اور علوم قدیمہ کی تعلیم کیوں گھٹ گئی ہے تو نواب صاحب نے بھی نو ۹ دن کے اندر ایک مبسوط رسالہ لکھا جس میں انھوں نے سوال کے ہر جزیہ پر نہایت مدلل بحثیں کیں۔ ان بحثوں میں صرف زور انشا ہی نہیں ہے بلکہ بنیادی و حقیقی امور کو تاریخ و واقعات اور ذاتی تجربات سے بیان کیا ہے۔ اُنھوں نے پہلے حصہ میں جو گورنمنٹ اسکولوں اور کالجوں میں مسلمانوں کی کمی کے متعلق ہے اس بات سے قطعی انکار کیا کہ مذہبی تعصب سدِ راہ ہے بلکہ اس کی وجہ یہ قرار دی کہ ان مدرسوں اور کالجوں میں طلباء کا اخلاق درست نہیں ہوتا۔ اُنھوں نے کورس کی تاریخی کتابوں پر بھی نظر ڈالی ہے جس کے مضامین سے مسلمانوں کی مذہبی توہین ہوتی ہے۔ حلقہ بندی اور تحصیلی مدرسوں میں اردو کی تعلیم کی کمی، افسرانِ تعلیم کا مسلمانوں کی ضروریات سے تغافل، بعض دل آزار اور ہندو مسلمانوں میں دشمنی کے جذبات پیدا کرنے والی کتابوں کا داخل نصاب ہونا اور نفس تعلیم کی عدم نگرانی پر بسیط بحث ہے۔ تیسرے حصہ میں کہ علومِ قدیمہ کی تعلیم کیوں گھٹ گئی عرب کی علمی تاریخ اور مسلمانوں کے علمی کارناموں اور یورپ کی تعلیمی حالت کا تذکرہ کرکے موجودہ زمانہ کی تعلیم کے نقائص سے بحث کی ہے اور اس تعلیمی تنزل کے تمام اسباب و علل کو بیان کیا ہے۔ چوتھے حصہ میں تعلیم نسواں کی

ضرورت اور اہمیت کو دکھایا ہے اور تیس جواب مضمون لکھنے والوں میں سے صرف نواب صاحب نے ہی اس مسئلہ پر کما حقہ توجہ کی ہے۔

یہ رسائل جب کمیٹی میں پیش ہوئے تو کمیٹی نے اس رسالہ پر درجہ دوم کا انعام تجویز کیا۔

اسی زمانہ میں انھوں نے سینٹفک سوسائٹی کے مقاصد کی تائید کے لحاظ سے منشی گلزاری لال اور بابو گنگا پرشاد کی اعانت سے فرنچ ریولیوشن اینڈ نپولین کا انگریزی سے اردو میں ترجمہ کیا جس کا نام سرگزشت نپولین بوناپارٹ رکھا ان کے دونوں رفیق عبارت پڑھ کر نواب صاحب کو ترجمہ سمجھاتے اور پھر یہ اس کو اردو کی شستہ عبارت میں لکھتے اور وہ دونوں اس پر نظر ثانی کرتے۔ اس طرح چند مہینوں کی گرم راتوں کی محنت میں انھوں نے اس ترجمہ کی تکمیل کی اور سررشتہ تعلیم سے ان تینوں کو انعام ملا۔

یہ کتاب سنہ ۱۸۷۱ء میں منشی نولکشور نے اپنے مطبع میں طبع کر کے لکھنؤ سے شائع کی۔

سنہ ۱۸۷۲ء میں جب محمدن اینگلو اورینٹل کالج فنڈ کمیٹی قائم ہوئی اور جابجا سب کمیٹیاں بنائی گئیں تو نواب صاحب نے علی گڈھ کمیٹی میں وصولی چندہ کے متعلق بڑی سرگرمی کے ساتھ کام کیا۔

کمیٹی کے دفتر کی نگرانی اور خصوصاً بجٹ کی تیاری بھی ان کے سپرد تھی۔ غرض سنہ ۱۸۷۵ء کی ابتدا تک جو ان کے حیدرآباد جانے کا زمانہ ہے سرکاری فرائض ادا کرنے کے بعد جو وقت ملتا وہ ان تعلیمی کوششوں میں صرف کرتے رہتے۔ ان کے قیام علی گڈھ سے سرسید کو خاص کر انتظامی معاملات میں بڑا اطمینان تھا۔ نواب صاحب نے خود ایک

موقع پر فخر کے ساتھ بیان کیا ہے کہ میں نے برسوں قومی کاموں کو بطور ایک ماتحت کے
سرسید کے زیر ہدایت انجام دیا ہے۔

ان جسمانی و دماغی خدمتوں کے علاوہ نواب صاحب بقدر حیثیت مالی امداد بھی کرتے
رہتے تھے اور اس وقت کا پانچ پانچ اور دس دس روپیہ کا چندہ آج کل کے سینکڑوں
اور ہزاروں کی رقم پر بھاری تھا۔

سرسید کے مشن کے علاوہ مقامی ہمدردیوں کے کاموں میں بھی برابر حصّہ لیتے رہے۔
میونسپل فرائض کو ادا کرنے میں نہایت سرگرم تھے ۱۸۶۹ء میں انھوں نے ایک
یونانی شفاخانہ اور باقاعدہ دواخانہ پرائیویٹ چندوں سے قائم کرایا۔

(۸)

حیدر آباد جانے کے بعد اگرچہ وہاں کے کاموں میں سخت مشغولیت تھی لیکن
جس عمارت کی بنیاد بھرنے میں انھوں نے دس سال تک کام کیا تھا یہاں بھی اُس کے
تعمیری کاموں میں برابر شریک رہے۔ اور جب وسط ۱۸۸۵ء میں وہ چند دنوں کے لئے
عارضی طور پر حیدر آباد سے جدا ہوئے تو انھوں نے علی گڑھ میں قیام کیا اور چونکہ وہ متعدد
کمیٹیوں کے ممبر تھے ہر کمیٹی میں محنت و انہماک کے ساتھ کام کرتے رہے۔ بورڈنگ ہاؤس
کا انتظام اور طلباء کی تربیت اخلاق کی نگرانی خاص طور پر ان کے سپرد کی گئی جس کے لئے
اُنھوں نے بورڈنگ ہاؤس میں سکونت اختیار کی۔

بورڈروں کے ساتھ اُن کی شفقت و محبت، ان کے آرام و راحت کا لحاظ اور ان کی اخلاقی تربیت و اصلاح کے طریقے اس زمانہ کے طلباء میں ابھی تک زبان زد ہیں اور بطور روایت کے بیان کئے جاتے ہیں۔

وہ زجر و سرزنش کو سزا کا آخری درجہ سمجھتے تھے۔ چھوٹے چھوٹے قصوروں سے بظاہر چشم پوشی کر جاتے لیکن کسی نہ کسی موقع پر قصوروار کو اُس کے قصور سے اس طرح آگاہ کرتے کہ وہ خود اپنے ضمیر سے تنبیہ حاصل کر لیتا۔ اکثر و بیشتر قصوروں کے موقعہ پر طلبا کے جذبات غیرت اور حمیتِ نفس کو اس طرح متحرک کر دیتے کہ وہ آئندہ کے لئے تائب و محترز ہو جاتے۔ راتوں کو نگرانی بہت سخت تھی اور انھوں نے وقت پر سونے اور وقت پر جاگنے کا عادی بنانے میں زیادہ توجہ کی تاکہ راتوں کے اطمینان میں طلباء لہو و لعب میں وقت گزار کر اپنی صحت خراب نہ کرلیں۔

طلباء کے ساتھ اُن کو شفقت بالکل ایسی ہی تھی جیسی اپنی اولاد کے ساتھ ہوتی ہے وہ ان کی تکالیف سے سخت متاثر ہو جاتے تھے۔ ۱۸۸۲ء میں جب تعلیمی کمیشن کے سامنے انھوں نے اپنی شہادت پیش کی ہے تو عام تعلیمی مسائل پر بحث کرتے ہوئے امتحان کی سختیوں کے ساتھ زمانہ امتحان پر جو موسم بارش گزرتے ہی شروع ہو جاتا تھا کمیشن کو توجہ دلائی اور بارش کی اُمس میں طلباء جس طرح امتحان کے لئے تیاری میں تکالیف برداشت کرتے تھے اس کو نہایت موثر طور پر بیان کیا۔

اخلاق اسلامی اور اعمالِ مذہب کی پابندی کے متعلق البتہ تشدد کو جائز رکھتے تھے

لیکن اس کی شاذ ہی نوبت پہنچتی تھی۔ قصوروں پر سزائے بدنی کے متعلق ان کے اور سرسید کے مابین سخت اختلاف تھا اور جب تک نواب صاحب انچارج رہے انھوں نے اس طریقہ کو جاری نہیں ہونے دیا۔ وہ سزا سے زیادہ ملامت کو موثر سمجھتے تھے وقتاً فوقتاً حسب موقع و ضرورت طلباء کے سامنے تقریریں بھی کرتے تھے جس کا زیادہ تر موضوع تربیت اخلاق اور پابندی احکام مذہب ہوتا۔ بورڈنگ ہاؤس کے متعلق جب کوئی متعصب معترض کوئی غلط فہمی پھیلانے والا مضمون اخباروں میں لکھتا تو نواب صاحب اس کے جوابات بھی شائع کرتے رہتے تھے۔ غرض جب تک وہ حیدرآباد واپس نہیں گئے کالج اور بورڈنگ ہاؤس کے کاموں میں مصروف رہے۔

اسی دوران میں حاجی اسمٰعیل خاں صاحب رئیس دتاولی نے سرسید کے احسانات کے اعتراف میں ان کی یادگار قایم کرنے کی تحریک پیش کی۔ نواب صاحب نے نہایت دلچسپی اور شغف کے ساتھ اس کی تائید کی اپیلیں شائع کیں اور جو کمیٹی فراہمی چندہ کے لئے قایم ہوئی اس میں سکریٹری کی حیثیت سے کام کیا اور ایک معقول رقم فراہم کرلی۔

اب حیدرآباد میں اگرچہ اُن کے فرائض بہت اہم اور نازک تھے جہاں فرصت کا نام تک نہ تھا لیکن وہ اپنے قومی کالج اور قومی تعلیم کے خیال سے ایک لحظہ کو بھی غافل نہیں رہے اور امکانی کوششوں میں کوئی دقیقہ باقی نہیں رکھا۔

۱۸۸۹ء میں سرسید نے مسٹر اسٹریچی بیرسٹرایٹ لا اور سید محمود کے مشورہ سے قواعد و قوانین تیار کرائے اور ساتھ ہی اس خیال سے کہ یہ کالج جس مقصد اور پالیسی سے

قایم کیا گیا ہے سید محمود اس کے متعلق تمام صلاح و مشورہ میں شریک غالب رہے ہیں۔
ان کو اپنے بعد اس کا سکرٹری مقرر کرانا چاہا لیکن اس طرح آئندہ کے لئے سکرٹری
کے تقرر کو تقریباً سب ہی نے ناپسند کیا اور شدید ترین اختلاف پیدا ہو گیا۔ مولوی سمیع اللہ
خاں سی ایم جی نے جو کالج کی بنا میں سرسید کے برابر کے ساتھی تھے سخت ترین مخالفت کی
نواب صاحب بھی سرسید کی اس کارروائی سے متفق نہ تھے انھوں نے خانگی
خطوط کے ذریعہ سے سمجھایا اور خود رخصت لے کر آنے اور اصلاح کرنے کا ارادہ
ظاہر کیا لیکن معاملہ نے اس قدر طوالت اختیار کر لی تھی کہ سرسید نے صاف طور پر لکھ دیا
کہ "اب یہ معاملہ حد سے گزر گیا ہے کہ اس میں کچھ ترمیم ہو سکے"۔ اس معاملہ میں سرسید نے
اپنی رائے پر استقامت اور ضد کی حد کر دی اور یہاں تک دھمکی دی کہ اگر رائے دینے والے
اس سے اتفاق نہ کریں گے تو وہ صرف سکرٹری کے عہدہ سے ہی استعفا نہ دیدیں گے
بلکہ جو مدرسہ کے متعلق اس وقت تک ہوا ہے اس کو ملیا میٹ کر کے رکھ دینگے۔
انھوں نے نواب صاحب کو مرعوب و متاثر کرنے میں کوئی دقیقہ باقی نہیں رکھا
لیکن نواب صاحب نہ تو سرسید کی عظمت و احترام سے مرعوب ہوئے اور نہ ان کے
احسانات و عنایات و محبت سے متاثر ہوئے اور اس انتخاب سے زبردست اختلاف
کیا اپنے انتخاب کے جو وجوہ انھوں نے لکھے ہیں اس میں لکھتے ہیں کہ

"میری خود کبھی ہمت نہ پڑتی کہ میں اس آزادی سے اپنی رائے لکھتا اگر
مجھ کو یہ خوف نہ ہوتا کہ ایک دن مرنا ہے اور خدا کے سامنے اپنے اعمال کا

جواب بھی دینا ہے۔ اگر ایک خدا کا گناہ ہو جائے تو ممکن ہے کہ اُس سے
توبہ کریں اور وہ اپنی رحیمی سے بخش دے۔ انسانوں کے متعلق اگر
ایک دو کی نسبت کچھ خطا ہو جائے تو اُن سے معذرت کر کے صفائی
حاصل کر سکتے ہیں لیکن قوم اور ملک کا گنہگار کس کس سے اور کہاں کہاں
تک اپنا گناہ بخشواتا پھرے گا۔ تمام عمر بھی اگر صرف ہو جائے تو عہدہ برآ نہیں ہو سکتا۔

سرسید کو نواب صاحب کے اختلاف سے بہت صدمہ ہوا اور وہ ایک حد تک کشیدہ ہو گئے۔ لیکن نواب صاحب کے دل میں سرسید کی وہی عظمت و محبت قایم رہی اور جب کہ مولوی سمیع اللہ خاں اور اُن کے رفقاء نے کالج سے اپنا قطع تعلق کر لیا تھا نواب صاحب بدستور اس کے معین و مددگار رہے اور کثرتِ رائے کے فیصلے کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیا۔
اس موقع پر حاجی اسمٰعیل خاں صاحب نے سید محمود کی یادگار کی جو تجویز پیش کی اگرچہ اس میں پارٹی اسپرٹ تھی اور تجویز یادگار کی تحریر کو ایک قسم کا فتح نامہ بنا دیا تھا جس پر نواب صاحب نے افسوس و اعتراض بھی کیا لیکن چونکہ تجویز بنفسہ مفید تھی اس میں نہایت کشادہ دلی کے ساتھ چندہ دیا۔ علاوہ براین کالج کی دیگر ضروریات کے لئے نواب سر آسمان جاہ سے امداد دلوائی اور آسمان منزل کی عمارت کے سلسلۂ تعمیر میں گراں قدر رقوم چندہ میں وصول کرائیں۔

۱۹۰۸ء میں جب سر راجہ امیر حسن خاں تعلقدار محمود آباد (اودھ) نے اپنا سالانہ بند کر لیا تو چند دوستوں کے ساتھ اس نقصان کو پورا کرنے میں کوشش کی۔

سنہ ۱۸۹۱ء میں جب کالج کی ترقی کے لحاظ سے لاکلاس کا قایم ہونا نہایت ضروری تھا اور سرسید اخراجات کی طرف سے بہت پریشان تھے انھوں نے نواب صاحب کو اپنی پریشانیاں لکھیں اور خواہش کی کہ گورنمنٹ نظام کی امداد دوگنی ہوجائے اور نظام میوزیم کی تعمیر کے لئے معقول رقم فراہم ہوجائے تو یہ سب پریشانیاں دور ہوں۔ نواب صاحب نے فوراً کوشش شروع کی کہ سرسید ایک ڈیپوٹیشن لے کر آئیں اور اعلیٰ حضرت ایڈریس قبول فرمائیں اور اس طرح کالج کی مالی مشکلات حل ہوجائیں۔ یہ کوشش کامیاب ہوئی۔ سرسید کو اطلاع دی گئی اور ستمبر سنہ ۱۸۹۱ء میں سرسید ایک ڈیپوٹیشن لے کر حیدرآباد گئے۔ اعلیٰ حضرت نے ۱۰ ستمبر کو ایڈریس قبول فرمایا اور اس کا حوصلہ افزا جواب دیا اور ۱۲ ستمبر کو ایک ہزار روپیہ ماہانہ اضافہ کا حکم سرسید کے ہاتھوں میں پہونچ گیا۔

اس شاہانہ امداد کے علاوہ ۴۲ ہزار پانچسو روپئے ایک دن کے چند گھنٹوں میں جب کہ یہ پارٹی اسپیشل ٹرین کے ذریعہ سے نواب صاحب کے ساتھ ورنگل گئی تھی عمائد ورنگل نے نظام میوزیم کی تعمیر کے لئے پیش کیا۔

ڈیپوٹیشن کو جو غیر متوقع کامیابی ہوئی اس نے سرسید کے دل پر ایک خاص اثر کیا چنانچہ ۲۰ ستمبر کے خط میں لکھتے ہیں کہ:-

> "حیدرآباد میں جو کچھ ہوا وہ صرف آپ کی عنایت، آپ کی کوشش آپ کی سعی، آپ کی توجہ، مختصراً یہ کہ آپ کی ذات سے ہوا۔ اس کا شکریہ کسی طرح ادا نہیں ہوسکتا۔"

نواب صاحب نے ابتدا سے علاوہ دماغی و جسمانی امدادوں کے اپنی استطاعت کے تناسب سے ہمیشہ فیاضی کے ساتھ مالی امدادیں بھی کیں۔ چاہ اخوان الصفا، سٹڈنس یونین کلب یادگار سید ظہور حسین، محمود منزل، تعمیر حمام، خام جو ونگ بادس، پختہ بورڈنگ ہاؤس سالار منزل، اورینٹل اسکول کلاسز، دیوار احاطۂ کالج، اسٹریچی ہال، نظام میوزیم آسمان منزل کے میں سینکڑوں سے ہزاروں تک کی رقمیں دیں۔ لاکلاس میں ماہانہ چندہ دیا سنہ ۱۸۹۱ و ۹۲ء بجٹ میں جو کمی آئی اس کے پورا کرنے میں حصہ لیا۔ دینیات کے وظائف و انعامات خاص کی تحریک کی اور پہلا چندہ تین سو روپیہ کا اپنے پاس سے دیا۔ انٹرمیڈیٹ میں فیل شدہ طلباء جو بوجہ عدم استطاعت فیس ادا کر کے تعلیم جاری نہیں رکھ سکتے تھے ان کی امداد کے لئے فنڈ کھلوایا اور پانچسو روپیہ کے قریب اپنی امداد دی۔

سرسید جب حیدرآباد گئے ہیں تو بتقریب دورہ ایک ہزار اور معاوضہ دعوت میں پانچسو روپئے پیش کئے۔

سرسید بعض اوقات ان کی طرف سے کسی فنڈ میں خود رقم چندہ معین کر کے یا کسی طالب علم کا وظیفہ مقرر کر کے صرف اطلاع دے دیا کرتے تھے اور وہ رقوم ادا ہوتی رہتی تھیں۔ اسی پر اکتفا نہیں تھا بلکہ دوسروں پر چندہ قایم کر کے ان کی تحویل میں دکھایا جاتا اور ان کا فرض تھا کہ خود ادا کریں یا جس کا چندہ ہے اس سے وصول کرائیں۔

نواب صاحب کا معمول تھا کہ جب ان کا اضافہ ہوتا تو ایک ماہ کا اضافہ وہ ہمیشہ کالج کے نذر کیا کرتے تھے اور اس پر ابتدا سے آخر تک قایم رہے۔

۱۸۹۰ء میں سرسید نے محمد بن سعد کاتب الواقدی کی تاریخ کے ایک باب کا ترجمہ
کرایا تھا اس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نامہ ہائے اقدس ہیں اور اُن وفود کا
حال ہے جو آنحضرت صلعم کے حضور میں قوموں کی طرف سے آئے نواب صاحب نے
اس کو طالبانِ فائدہ کے لئے اپنے صرف سے طبع کرا کے کالج کو ہدیہ دے دیا۔
کالج کے علاوہ بھی سرسید بعض غریبوں کی ذاتی امداد کے لئے سفارش کیا کرتے
تھے اور نواب صاحب ہمیشہ اس کو خوشی کے ساتھ منظور کرتے تھے۔
نواب صاحب نے جو بیش قرار امدادیں کی تھیں اُن سے سرسید نے متاثر ہو کر
۲۹ نومبر ۱۸۹۰ء کے انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں ایک خاص مضمون بہ عنوان "فیاضی نواب
انتصار جنگ مولوی مشتاق حسین" سپرد قلم کیا تھا۔
پھر ۱۸۹۱ء میں نواب صاحب کی قومی ہمدردی کے بیش بہا خدمات کے شکریہ
میں ان کی یادگار کی تحریک کرتے ہوئے کہا کہ:-

"نواب وقار الملک مولوی مشتاق حسین نے بہ لحاظ قومی ہمدردی کے
جو بیش بہا خدمات کالج کی کی ہیں وہ آپ سب صاحبوں کو معلوم ہیں انھوں
نے اپنی جیب خاص سے متعدد مرتبہ زر کثیر بطور سبسکرپشن کے کالج کو عطا
کیا ہے۔ ان کے خاص عطا کئے ہوئے روپیہ سے ایک پختہ بورڈنگ ہاؤس
کالج کی عمارتوں میں بنایا گیا ہے۔ اسکول کا بڑا ہال اور مسجد مدرسۃ العلوم جس قدر
کہ اب تک تیار ہوئی ہے جو نواب بشیر الدولہ سر آسمان جاہ کی بے نظیر فیاضی کی

یادگار ہے اس میں بھی اور نیز آسمان منزل کے چندہ فراہم ہونے میں
مولوی محمد مشتاق حسین صاحب کی سعی و کوشش کا بہت بڑا حصہ ہے۔
حال میں جو ڈپوٹیشن حیدرآباد میں گیا اس کے تمام اغراض و مطالب کو
مولوی محمد مشتاق حسین نے بہ احسن وجوہ بحضور عالی ہز ہائینس نظام اور
ہز اکسلنسی سر آسمان جاہ مدار المہام کی خدمت میں پہنچایا جس کا نتیجہ الیسی فیاضی
کی صورت میں ظاہر ہوا جس کی نظیر مسلمانوں کی فلاح و بہتری کے کاموں
میں نہیں پائی جاتی۔

علاوہ اس کے ان کی ذاتی جسمانی محنت جو انھوں نے مدرسۃ العلوم
میں کی کسی طرح فراموش ہونے کے قابل نہیں ہے.... پس ان کے یہ
تمام احسانات اس قابل ہیں کہ ان کی ایک مستقل یادگار مدرسۃ العلوم
میں قایم کی جائے۔

اس کے بعد سر سید نے عمارات کا تذکرہ کر کے کہا کہ

پس میں تحریک کرتا ہوں کہ بیادگار احسانات مولوی محمد مشتاق حسین
یہ عمارت ان کے نام سے موسوم ہو اور مشتاق منزل[1] کہلائے۔"

---

[1] - یہ عمارت اسٹریچی ہال کے سلسلہ عمارات میں جانب غرب مسجد کے متصل واقع ہے لیکن ہنوز اس پر کوئی کتبہ نہیں لگایا گیا ہے جس سے معلوم ہو سکے کہ یہ "مشتاق منزل" ہے افسوس ہے کہ اس عمارت مغربی برآمدہ میں چوکھٹ کواڑ لگا کر ریاست نابھہ کے ایک فیاض معطی کی یادگار ہیں جس کا چندہ الصلہ مدغوں

باقی بر صفحہ ۳۶

(۹)

حیدرآباد سے وظیفہ یاب ہونے کے بعد انھوں نے اپنے وطن امروہہ میں قیام کیا اور باوجود خانگی تردد و مصائب اور قابل و جوان فرزند اور بیوی اور کئی اعزا کی موت کے انھوں نے کالج اور قومی کاموں کی طرف سے غفلت نہیں کی۔

اس زمانہ میں کالج کے انتظامی حالات بہت کچھ اصلاح کے محتاج تھے اور یہ موقع تھا کہ سرسید کے دونوں رفیق نواب محسن الملک اور نواب وقار الملک اصلاح کرتے انھوں نے کوششیں شروع کیں لیکن سرسید پر بعض لوگوں نے ایسا اثر قایم کر لیا تھا کہ وہ ہر چیز انھیں کے نقطۂ نظر سے دیکھتے تھے۔ نواب وقار الملک نے نظام کالج کی اس ابتری پر توجہ دلائی لیکن کوئی اثر نہ ہوا اور چونکہ کالج ایک قومی امانت تھی اس لئے نواب صاحب کو باوجود اس محبت و شکر گزاری اور ادب و احترام کے جو سرسید کی نسبت ان کے دل میں تھا کسی قدر تیز روش اختیار کرنی پڑی اور تحریروں میں گرمی بھی آگئی۔

جنوری ۱۸۹۶ء میں سرسید نے اپنے قانونی اختیار کی تاویل سے اکیس ۲۱ جدید ٹرسٹی منتخب کر کے موجودہ ٹرسٹیوں کو صرف اطلاع دے دی۔ اس طرح بہت بڑی مجارٹی حاصل کر لی نواب صاحب نے پہلے پرائیویٹ تحریر میں اس کارروائی پر اعتراض کیا لیکن سرسید نے

بسلسلہ ص ۳۵ - ان معلی سے عطا کیا تھا کہ قرآن خوانی بنا کر ان کے نام کا کتبہ لگا دیا گیا ہے اور اس طرح اس یادگار میں جس کو خود سرسید نے قایم کیا تھا عہد موجودہ کے اراکین نے قطع برید کر کے عمارت کی شان کو بھی خراب کر دیا۔

جواب میں صاف لکھ دیا کہ

"جن اُمور کو آپ تصور کرتے ہیں کہ قومی کالج کے لئے مبارک فال نہیں ہیں ہم انھیں اُمور کو قومی کالج کے لئے مبارک فال سمجھتے ہیں پس اس کا کوئی علاج نہیں ہے اور یہ یقین کرنا چاہیئے کہ خدا کو جو منظور رہا وہ ہوگا۔"

آخر نواب صاحب نے مجبور ہو کر بجٹ میٹنگ میں اس کارروائی پر اعتراض کیا تو سرسید کے غضب آلود جواب کی بنیاد پر مرزا عابد علی بیگ کی تحریک اور مولوی نذیر احمد کی تائید سے نواب صاحب کے متعلق "ملامت کا ووٹ" پاس کیا گیا۔ مگر نواب صاحب نے اس ملامت کا کوئی اثر قبول نہیں کیا اور ٹرسٹی شپ کے فرائض و ذمہ داری کو صداقت و مضبوطی کے ساتھ ادا کرتے رہے۔

سرسید کے انتقال کے بعد کالج پر بہت نازک وقت آگیا نواب صاحب ان مواقع پر متعدد مرتبہ علی گڑھ گئے اور اصلاح حالات کی جو کوششیں ان سے ممکن تھیں کرتے رہے سرسید میموریل فنڈ کی کامیابی کے لئے بھی سعی کی اور خود بھی ایک معقول رقم پیش کی اس موقع پر جب کہ سید محمود کے عزل کا سوال ہر طرف سے پیش تھا تو انھوں نے ۱۸۹۰ء کے فیصلہ کے احترام کو ملحوظ رکھتے ہوئے درخواست کی کہ ایک موقع اصلاح حالات کا اور دیا جائے۔ یہ رائے تسلیم کی گئی اور نواب صاحب مامور کئے گئے کہ سید محمود سے گفتگو کریں، چنانچہ انھوں نے گفتگو کی مگر کوئی تشفی نہ ہوئی اور حسرت و افسوس کے ساتھ ان کے معزول کئے جانے سے اتفاق کیا۔

نواب صاحب کی سب سے بڑی اور اصولی کوشش یہ تھی کہ قانون و قواعد میں ضروری ترمیمات و اصلاحات ہوجائیں چنانچہ ایک کمیٹی قایم ہوئی نواب صاحب اس کے سکریٹری منتخب ہوئے انھوں نے اسی غرض کے لئے سید محمود کے پاس علی گڑھ اور سیتاپور میں قیام کرکے مسودہ تیار کیا اور ٹرسٹیوں سے رائیں طلب کیں لیکن ممبروں کی عدم دلچسپی اور کام کی سستیٔ رفتار کے باعث وہ مستعفی ہوگئے۔

نواب محسن الملک نے اپنی تمام قوتوں کو کالج کی مالی حالت کے استحکام اور اس کی وسعت و شہرت کی طرف مبذول کردیا تھا اگرچہ ان دونوں کی پالیسیوں میں اختلاف تھا لیکن نواب صاحب اپنے رفیق کی ہر نازک موقع پر اعانت و حمایت کرتے رہے بہ زمانہ میکڈانل کے زمانہ میں جب اردو ہندی کے جھگڑے میں نواب محسن الملک کی آزادی رائے روک دی گئی اور انھوں نے استعفا پیش کیا تو نواب صاحب نے استعفے کی واپسی پر بے انتہا اصرار کیا ہز آنر سر جیمس لاٹوش سے پرائیویٹ ملاقات کرکے نواب محسن الملک کے سکریٹری رہنے کی ضرورت پر زور دیا۔

نواب محسن الملک کے زمانہ میں اگرچہ کالج کی مالی حالت ترقی پزیر تھی۔ اس کا دائرہ اثر بڑھ رہا تھا لیکن اندرونی نظام میں کوئی تبدیلی نہیں ہوسکتی تھی۔ اسٹاف اور طلباء کے تعلقات روز بروز زیادہ خراب ہوتے جاتے تھے (آنریبل سر) مارلیسن صاحب جانے والے تھے اور ان کی خواہش تھی کہ مسٹر کارنا پرنسپل مقرر کئے جائیں اور نواب محسن الملک بادل ناخواستہ ان سے متفق تھے چونکہ مسٹر کارنا میں اُن اوصاف کا فقدان تھا جو اس قومی کالج کے پرنسپل

کے لئے ضروری ہیں اس لئے باخبر حلقوں میں انتخاب کو اندیشناک تصور کیا جاتا تھا۔ نواب صاحب کی حالت یہ تھی کہ وہ نواب محسن الملک کے ساتھ حتی الامکان کسی شدید اختلاف سے احتراز کرتے تھے لیکن اس موقع پر ان کو سخت اختلاف کرنا پڑا اور پوری قوت کے ساتھ مسٹر کارنا کے انتخاب کی تجویز کو مسترد کرایا بعض دوراندیش احباب نے یہ تجویز بھی پیش کی کہ نواب صاحب اپنی سکونت علی گڈھ میں اختیار کرکے کالج کے اندرونی نظم ونسق کی نگرانی کریں نواب محسن الملک کا بھی یہی اصرار تھا لیکن جب وہ راضی ہوگئے اور کل انتظام بھی کرلیا تو بعض نامعلوم وجوہ سے نواب محسن الملک نے ہی اس کو مناسب تصور نہیں کیا اور کل انتظامات منسوخ کردیئے گئے۔ اسٹرائک کے نازک زمانہ میں جو اندرونی خرابیوں کا لازمی نتیجہ تھی نواب صاحب بھی شورش طلباء کے تحقیقاتی کمیشن میں ممبر تھے اور انھوں نے اس تحقیقات میں گہری اور عمیق باتوں پر زیادہ توجہ کی اور اصلی وجوہ واسباب کو آزادی کے ساتھ بیان کیا۔

(۱۰)

انھوں نے کالج کے علاوہ اور قومی کاموں میں بھی اپنا وقت صرف کیا۔ زیادہ وقت مسلمانوں میں سیاسی تحریک پیدا کرنے میں گزارا۔ وہ کانفرنس کے اجلاس دلی میں بھی اکثر شریک ہوئے اور ہمیشہ مفید بحثوں میں حصہ لیا۔

انھوں نے سرکاری اور امدادی مدارس میں مذہبی تعلیم کے اجرا کی بھی کوشش کی۔

اس کے متعلق بڑی بڑی یادداشتیں لکھیں۔ لفٹنٹ گورنر اور افسران سررشتہ تعلیم سے ملاقاتیں کیں اور بالآخر ایک اسکیم پیش کر کے اس کو منظور کرایا جس کی رو سے صوبہ متحدہ کے مدارس میں مقامی مسلمانوں کو اختیار دیا گیا کہ اسکولوں میں معمولی خواندگی شروع ہونے سے پہلے وہ ایک گھنٹہ مذہبی تعلیم کا انتظام کر سکیں۔ امروہہ کے مڈل اسکول کو ہائی اسکول بنانے میں کوشش کی اور تعلیم مذہبی کا خرچ اپنے ذمہ رکھا اور چونکہ قصبہ میں مسلمانوں کی آبادی بہت زیادہ ہے اس لئے یہ بھی طے کرایا کہ ہیڈ ماسٹر ہمیشہ مسلمان ہو۔ وہاں کے عربی مدرسہ کو تقویت دی۔ ٹیلیگراف آفس جاری کرایا اور جب تک کہ وہ خود اپنا خرچ ادا نہ کر سکے خود اخراجات ادا کرتے رہے۔

جس وقت مرادآباد اور دہلی کے مابین ریلوے کا اجرا ہونے والا تھا تو امروہہ اس لائن سے علیحدہ ہو گیا تھا نواب صاحب نے ریلوے کی مجوزہ لائن سے اختلاف کر کے لائن کا رخ بدلوایا اور اعداد و شمار سے ثابت کیا کہ لائن میں اس ترمیم سے زیادہ نفع ہوگا۔ انھوں نے گورنمنٹ میں ایک اہم تجویز دیہات میں طبی امداد کے متعلق بھیجی جس میں دیہاتی رعایا کی وہ تکلیفات جو طبی امداد میسر نہ ہونے سے پیدا ہوتی ہیں دکھائی تھیں گورنمنٹ نے اسکیم پر غور کیا لیکن مالی مشکلات کی وجہ سے اس کو منظور کرنے سے انکار کیا۔

اسی طرح دیہاتی تعلیم پر بھی ایک پُرزور یادداشت لکھی اور دیہاتی مدارس کے نصاب میں مفید تغیرات کا مشورہ دیا۔

بمبئی کی پراونشل کانفرنس کی جماعت عاملہ نے جب ان کو نہایت اصرار سے اجلاس

منعقدہ احمد آباد کا صدر منتخب کیا تو نواب صاحب نے پہلے اس صوبہ کے خاص خاص مقامات کا دورہ کر کے مسلمانوں کی تعلیمی حالت کا خود مشاہدہ کیا پھر اس کے لئے خطبہ صدارت تیار کیا جو اُنتیس سال کے ذاتی تجربات پر مبنی تھا اور جس میں قوم کی مختلف حالتوں کے لحاظ سے قابل العمل اور سہل الحصول مشورے تھے۔

۱۹۰۳ء میں فریضۂ حج بھی ادا کیا اور روضۂ نبوی صلعم کی سعادت زیارت سے بھی مشرف ہوئے۔ بمبئی ہیں جدہ کو روانگی کے وقت بھپارہ خانہ میں جانے پھر وہاں سے ساحل تک پیدل راستہ طے کرنے اور کشتی میں بیٹھ کر جہاز پر سوار ہونے میں جو سخت تکالیف ہوتی ہیں اُن کا اندازہ صرف حج کو جانے والے ہی کر سکتے ہیں۔ مولوی عبداللہ احمد صاحب محافظ حجاج نے ہر چند چاہا کہ نواب صاحب کے لئے خاص انتظام کریں لیکن انھوں نے امتیازی انتظام سے معذرت کی اور کہا کہ "میں عام مسلمانوں سے کوئی ممتاز حیثیت اختیار نہیں کرنا چاہتا۔"

جب حج سے فارغ ہو کر براہِ ینبوع مدینہ طیبہ جا رہے تھے تو ہر منزل میں قافلہ کے غرباء و محتاجین کے لئے لکڑی اور پانی کا انتظام اپنے صرفہ سے کراتے تھے۔

ینبوع سے دوسری منزل میں دو ضعیفہ عورتیں پاپیادہ تکلیف کے ساتھ راستہ چلتی نظر آئیں، بے اختیار اونٹ سے اُتر پڑے اور ان دونوں کو بٹھا دیا، اور خود پیادہ ہو گئے۔ مولوی مظہر علیم صاحب مرحوم سابق سفیر کانفرنس ہم سفر تھے انھوں نے دیکھا تو حاضر ہو کر اصرار کیا کہ "آپ بھی ضعیف ہیں میرے اونٹ پر سوار ہوں" مگر

اُنھوں نے نہ مانا اور کہا کہ "میاں یہ راستہ آنکھوں سے طے کرنے کا ہے یوں ہی چلنے دو"
اور اس طرح وہ دیارِ حبیب میں داخل ہوئے۔

چونکہ وہ خود غریب خاندان میں پیدا ہوئے تھے ان کے اکثر اعزا اور اہلِ برادری
غریب تھے ان کو اپنی شاندار زندگی میں بہت سے غریبوں کی پریشان حالت دیکھنے
کا موقع ملا تھا اس لئے ان کو حالتِ غریبی کا زبردست احساس تھا۔ اُنھوں نے اپنے
کنبہ اور برادری میں ایک تجویز پیش کی کہ صرف شادی کی چند تقریبات کے مصرف کو
بدل کر اس کا روپیہ غریبوں کی امداد میں صرف کیا جائے۔ سب سے پہلے خود اس پر
عمل کیا اپنے قریبی اعزا سے عمل کرایا اور اپنی برادری میں اس طریقہ کو رائج کیا

اُنھوں نے ندوہ کی بھی پُرجوش امداد کی اور اس کے اہم معاملات
میں اکثر اپنے تحریری و زبانی مشورے دیتے اور اراکین سے تبادلہ خیالات کرتے رہتے تھے
اور اُس پریشانی میں جو سر انٹونی میکڈانل کے زمانہ میں اراکین ندوہ کو تھی اُنھوں نے
پبلک اور پرائیویٹ طریقوں سے ندوہ کی حمایت کی۔

۱۹۰۳ء میں ان کو وطن کی تعلیمی خدمات اور فرقہ وارانہ فسادات میں امن و صلح
قائم کرانے کی کوششوں کے اعتراف کے طور پر گورنر جنرل بہ اجلاس کونسل نے ایک سارٹیفکیٹ
مرحمت کیا اور دربار تاجپوشی میں حکومت کی طرف سے مدعو کئے گئے۔

۱۹۰۴ء میں جب لفٹننٹ گورنر نے مراد آباد میں دربار کیا ہے تو اس میں بھی نواب صاحب
کی مذکورہ بالا خدمات کا خاص طور پر اعتراف کیا گیا۔

(۱۱)

پولٹیکل معاملات میں نواب صاحب بھی اگرچہ سرسید اور نواب محسن الملک کے ہم خیال تھے اور مسلمانوں کا کانگریس اور کسی ایجیٹیشن میں شریک ہونا بمنزلہ خودکشی کے تصور کرتے تھے اور ان کا خیال تھا کہ سیاسیات میں حصہ لینا صرف نوجوانوں کا کام ہے چنانچہ اُنھوں نے اس خیال کو ایک پرائیویٹ خط میں بھی اس طرح ظاہر کیا ہے کہ

"ہندوستان میں جس قسم کی حکومت ہو رہی ہے اس کے لحاظ سے رعایا کے لئے عمدہ تریں پالیسی یہی ہے کہ حکام کو حتی الامکان اپنے سے ناخوش نہ ہونے دے اور اس کے برخلاف کوئی کوشش نوجوانوں کا کام ہے۔ میرے ولولے اب آزادی اور مساوات کے متعلق پست ہو چکے ہیں اور میں اب اسی کو غنیمت سمجھتا ہوں کہ جو دن زندگی کے باقی ہیں وہ آرام کے ساتھ گزر جائیں۔"

لیکن ۱۹۰۰ئہ میں جب صوبہ متحدہ کی گورنمنٹ نے ہندی کے اجرا کے متعلق اپنا مشہور رزولیوشن صادر کیا تو نواب صاحب اس سے بہت متاثر ہوئے اور اب ان کے لئے زمانہ کے تغیرات اور سیاسی خیالات وحالات سے بے تعلق رہنا دشوار ہو گیا اور اس رزولیوشن کی احتجاجی کارروائیوں میں سرگرمی کے ساتھ حصہ لیا۔ لکھنؤ کی مشہور میٹنگ میں شریک ہو کر پُرزور تقریر کی اور اسی وقت سے ان کو قومی حقوق کے تحفظ کا خیال پیدا ہو گیا۔ ایک پولٹیکل آرگنائزیشن کو قایم کرنے کی تحریک شروع کر دی۔ اس مقصد کے لئے سب سے

پہلا جلسہ اکتوبر ۱۹۰۱ء میں بمقام لکھنؤ منعقد ہوا جس میں نواب صاحب نے ایک طویل تقریر میں اس بات کو ظاہر کرنے کے بعد کہ تمام ہندوستان میں کچھ عرصہ سے مسلمانوں کا درجہ کس طرح روز بروز تنزل کرتا جاتا ہے اور خاص خاص صوبوں میں بھی ان کے پولیٹیکل حقوق پر حملہ ہو رہا ہے اور اردو ناگری کے مسئلہ پر اشارہ کرتے ہوئے اور یہ کہ سرکاری عہدوں کی تعداد ان میں کس طرح روز بروز کم ہوتی جاتی ہے اور وسیرائے کی قانونی کونسلوں اور صوبوں کی قانونی کونسلوں میں وہ اپنے انتخاب سے اپنے ممبر نہیں بھیج سکتے انھوں نے اپنی ایک اسکیم پیش کی کہ کس طریقہ سے آئندہ ان خرابیوں کا انسداد اور اپنے حقوق کی حفاظت ہم کو کرنی چاہیے، اس اسکیم پر مباحثے ہوئے اور ایک ترمیم شکل میں وہ منظور کی گئی۔

اس کو کامیاب بنانے کے لئے نواب صاحب نے مختلف مقامات کے دورے کرکے اہل الرائے اصحاب سے مشورے حاصل کئے اور ہر جگہ جلسے منعقد کرائے اور مجوزہ آرگنائزیشن کے مقاصد بیان کئے۔

نواب صاحب اگرچہ اپنی بیوی کی علالت سے جو موت پر منتج ہوئی اور چھوٹے چھوٹے بچوں کی بیماریوں سے سخت پریشان تھے لیکن قومی کام کی دھن اور اس آرگنائزیشن کی تکمیل کی ضرورت نے ان کو دورے کرنے پر مجبور کر دیا اور انھوں نے اس عالم پریشانی میں اس کام کو مکمل کیا۔

انھی کوششوں کے دوران میں گورنمنٹ کی جانب سے قانونی کونسلوں میں اصلاحات کی تجویز کا اعلان شائع ہوا تو نواب صاحب نے فوراً ہی نواب محسن الملک سے اس اعلان اور

اس موقع پر مسلمانوں کی طرف سے ایک ڈیپوٹیشن کے ذریعہ سے ایڈریس پیش کرنے کے مسئلہ پر مراسلت شروع کر دی اور پھر ڈیپوٹیشن کے باریاب ہونے اور ایڈریس کی تیاری کے تمام مراحل میں پوری سرگرمی کے ساتھ کام کرتے رہے۔ متعدد جلسہ ہائے مشاورت منعقد کئے اور خود بھی بوضاحت کے ساتھ مسلمانوں کی قومی ضروریات و حالات کی یادداشتیں قلمبند کر کے بھیجیں اور جب تمام مراحل طے کر لئے گئے بعد اکتوبر ۱۹۰۶ء میں ڈیپوٹیشن پیش ہو گیا جس میں وہ خود بھی شریک ہوئے تو ۳۰ دسمبر کو ڈھاکہ میں مسلمانانِ ہند کی ایک پبلک میٹنگ منعقد کرائی اور چونکہ نواب صاحب اس سیاسی مجلس کے بانی تھے۔ نوجوانانِ قوم کے اصرار سے ان کو پہلے اجلاس کی صدارت قبول کرنی پڑی اور خطبۂ صدارت میں انھوں نے قومی پولیٹیکل پالیسی کے متعلق اپنی رائے کو ظاہر کیا جو رائے کہ مسلمانوں میں سیاسی تحریک کی بنیاد قرار پائی۔

اس جلسہ میں متعدد تجاویز پاس ہوئیں اور آل انڈیا مسلم لیگ قائم کرنے کے لئے ایک پراونشل کمیٹی قائم ہوئی اور بالآخر مسلم لیگ قائم ہو گئی اور نواب صاحب اس کے سکریٹری مقرر کئے گئے۔

نواب صاحب نے شملہ ڈیپوٹیشن کے میموریل، ویسرائے کے جواب اور لوکل گورنمنٹوں کے نام گورنمنٹ آف انڈیا کے مراسلہ کو شائع کرایا تاکہ مسلمان اہل الرائے غور کر سکیں کہ مسلمانوں کے حقوق کی بہترین حفاظت کے خیال سے کس کس امر کی اور گورنمنٹ سے استدعا کرنی چاہیے اس کے بعد دسمبر ۱۹۰۷ء میں بمقام کراچی اجلاس منعقد ہوا اور لیگ کا کانسٹی ٹیوشن بھی

مکمل ہوگیا لیکن چونکہ دسمبر میں آنریری سکریٹری کالج کے عہدہ پران کا انتخاب ہوگیا تھا اس لئے لیگ کی سکریٹری شپ سے اس بناء پر استعفا دے دیا کہ وہ دونوں کام انجام نہیں دے سکتے تھے اور مقتضائے مصلحت بھی نہ تھا کہ یہ دونوں ذمہ داری کے کام ایک ہی وجود سے وابستہ رہیں لیکن وہ لیگ کے ممبر رہے اور اس کے جلسوں میں وقتاً فوقتاً شریک بھی ہوتے رہے ہے۔ انھوں نے لیگ کے ذریعہ سے نہ صرف قانونی کونسلوں میں حق انتخاب تعداد نیابت اور جداگانہ حلقہ انتخاب کی کوشش کی بلکہ اس کوشش کو میونسپلٹیوں اور ڈسٹرکٹ بورڈوں تک وسیع کیا۔

اسکیم اصلاحات پر مسلم لیگ کی طرف سے غور کرنے کے لئے جو جلسے منعقد ہوئے اس کے مباحث میں پورا حصہ لیا اور آخری اور قطعی تجویز ان کے اور میجر ڈاکٹر سید بلگرامی کے دستخطوں سے گورنمنٹ میں بھیجی گئی۔ البتہ نواب صاحب نے گورنمنٹ کی ایڈوائزری کونسل میں والیانِ ملک کے ممبر بنائے جانے سے اختلاف کیا جس میں دوسرے لوگ بھی اپنی قابلیت و تجربہ کی بنیاد پر ممبر بنائے جاتے تجویز ہوئے تھے کیونکہ یہ کسی طرح مناسب نہ تھا کہ والیانِ ملک قانون پیشہ اور اُسی درجہ کے دوسرے ممبروں کے ساتھ یکساں حیثیت سے مباحثات میں شریک ہوں جس سے ان کا درجہ ان کی رعایا کی نظروں میں گھٹ جاتا۔

اُنھوں نے اس رائے کو اپنی طرف سے علیحدہ لکھ کر گورنمنٹ میں بھیجا اور جب اسکیم اصلاحات طے ہو کر شائع ہوئی تو اس میں سے کونسل کو قطعاً ہی خارج کر دیا گیا۔

کالج کے فرائض نے اگرچہ ان کی سیاسی سرگرمی کم کر دی تھی لیکن دلچسپی بدستور

قایم رہی اور اپنے مفید مشوروں سے ہر موقع پر قوم کی سیاسی رہنمائی کرتے رہے۔

(۱۲)

اگرچہ قواعد و قوانین کالج کے لحاظ سے سکریٹری کے انتخاب میں ٹرسٹیوں کے سوا اور کسی طبقہ یا جماعت کو کسی قسم کا حق رائے دہندگی حاصل نہ تھا لیکن نواب محسن الملک کے انتقال کے بعد ہر گوشۂ ہندوستان سے تمام مسلمانوں نے دلی جوش اور تمناؤں کے ساتھ اس خواہش کا اظہار کیا کہ "نواب وقارالملک کو سکریٹری منتخب کیا جائے"۔ اسلامی پریس نے پُرزور مضامین شائع کئے کہ "اس عہدہ کے لئے ان سے زیادہ کوئی موزوں نہیں"۔ جابجا جلسے منعقد کئے گئے اور ٹرسٹیوں کو تاروں کے ذریعہ سے کارروائیوں کی اطلاع دی گئی کہ "ان کے سوا اس جلیل القدر منصب پر کوئی اور مامور نہ کیا جائے"۔ بقول نواب سر محمد مزمل اللہ خاں بہادر کے سی ایس آئی جو اس وقت قایم مقام سکریٹری تھے کہ "مجھ کو گزشتہ پچیس سالہ لائف میں کوئی ایسا واقعہ یاد نہیں ہے جس میں قوم کی طرف سے کسی امر پر اس قدر شد و مد اور ایسے جوش و خروش اور ایسے اتفاق کے ساتھ اظہار رائے کیا گیا ہو"۔ ٹرسٹیوں کے دلوں میں بھی نواب صاحب کے اخلاق و قابلیت اور ان کی قومی خدمات کی عزت و عظمت مرکوز تھی انھوں نے ۱۵ دسمبر ۱۹۰۷ء کے ایک مخصوص اجلاس میں بلا اختلاف نواب وقارالملک ہی کو آنریری سکریٹری کے عہدہ پر منتخب کیا اور آخر دسمبر میں اجلاس کانفرنس منعقدہ کراچی میں کانفرنس کی طرف سے

بالاتفاق اس انتخاب پر اظہارِ مسرت و اطمینان کیا گیا۔ نواب صاحب نے جنوری ۱۹؁
میں اس عہدہ کا جائزہ لیا چونکہ ان کے علم میں پہلے سے بہت سے اُمور قابل اصلاح تھے
انھوں نے اُن پر سرگرمی کے ساتھ اپنی توجہ منعطف کی اور آنریری سکریٹری کی حیثیت سے
کالج میں پہلا قدم رکھتے ہی بالاعلان اس امر کو ظاہر کر دیا کہ میں پارٹی فیلنگ کو پسند نہیں کرتا
اور نہ صرف ٹرسٹیوں کی پارٹی میں اس فیلنگ کے پھیلنے کو میں روکوں گا بلکہ اولڈ بوائز کی
پارٹی فیلنگ کو بھی حتی الامکان کمزور کرنے کی کوشش کروں گا اور میں اپنے گرد و پیش کوئی
پارٹی قایم کرنا نہیں چاہتا" انھوں نے ہمیشہ ہر ایک مخالف و موافق رائے کو نہایت آزادی
اور ٹھنڈے دل کے ساتھ سنا اور جو رائے کالج کے حق میں مفید تصور کی اس سے اتفاق
اور جو مضر معلوم ہوئی اس سے اختلاف کیا اور اس طرح ان کو اپنے ساتھیوں کی رائے
سے بڑی مدد ملتی رہی اور پارٹی فیلنگ بھی کمزور ہوتا رہا۔ ٹرسٹیوں کی تعداد ابتدا سے
ستر چلی آتی تھی لیکن چونکہ ان کا تقرر حین حیاتی ہوتا تھا اس لئے خواہ جدید ضرورتیں پیدا ہوں
یا بعض اصحاب اپنے ایثار اور قومی خدمات سے اپنے آپ کو اس جماعت میں شامل ہونے
کے قابل ثابت کریں، ان کے تقرر کا موقع نہ ملتا تھا پھر کالج کا حلقۂ اثر بہت وسیع ہو گیا
تھا قوم میں پُر جوش کام کرنے والوں کی تعداد بھی بڑھ رہی تھی اس لئے نواب صاحب
نے بہ ترمیم قواعد ۲۰۰ تک تعداد پہنچائی اور ہر سال ایک مناسب تعداد میں مختلف صوبوں
سے تعلیم یافتہ اور ہمدرد اصحاب کا انتخاب عمل میں آتا رہا جس سے ٹرسٹیوں کی جماعت
کی قوت میں کافی اضافہ ہو گیا۔

انھوں نے تقسیم عمل کے اصول پر اور عام دلچسپی پیدا کرنے کے لئے ٹرسٹیوں کی جماعت میں سے ایک سنڈیکیٹ بنایا اور اس میں انتخاب سے ممبر مقرر کرکے کالج کے تمام شعبوں کو ان پر تقسیم کر دیا اور چند قواعد بطور ضابطہ کارروائی وضع کئے گئے اور اس طرح متعدد قابل اصحاب کو آنریری سکریٹری کی نگرانی میں کالج کے کاموں کا عملی تجربہ حاصل ہونے کے علاوہ کام کرنے کا حوصلہ بھی بڑھ گیا۔

ان میں چونکہ جمہوریت پسندی کا زبردست مادہ تھا اس لئے وہ جمہور کی رائے کی زیادہ وقعت کرتے تھے اگرچہ یہ ضرور نہیں تھا کہ وہ اس سے اتفاق بھی کرلیں وہ اپنے آپ کو نہ صرف ٹرسٹیوں کا سکریٹری سمجھتے تھے بلکہ معاملات کالج میں تمام قوم کا سکریٹری تصور کرتے تھے اور ان کی طرف سے عام آزادی تھی کہ جو شخص چاہے معاملات کالج کے متعلق ان سے تبادلہ خیالات کرے اور جہاں تک ان کو فرصت ہوتی وہ دلچسپی کے ساتھ اس قسم کے تبادلہ خیالات کو اپنا خوشگوار فرض سمجھتے اخبارات کی نکتہ چینی سے کبھی کسی بدمزگی کا اثر ان کے دل پر نہیں ہوتا تھا بلکہ نکتہ چینی کو وہ ایک قسم کی مدد سمجھتے تھے اور ہمیشہ اس کو عزت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ ان کا اصول تھا کہ "ہم کو اپنا انتظام درست رکھنا چاہئے اور پھر اگر کوئی غلط حملہ ہو تو نہایت ٹھنڈے دل سے اس کے جواب میں اصلی واقعات پبلک کے سامنے ظاہر کر دیئے جائیں اور فیصلہ پبلک پر چھوڑ دیا جائے" چنانچہ اس زمانہ میں جس قدر نکتہ چینیاں ہوئیں اگر ان میں صداقت ہوئی تو انھوں نے صاف طور پر قبول کرلیا ورنہ اصلی واقعات پبلک پر ظاہر کر دیئے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ طبقہ متوسط اور عوام کو کالج کے ساتھ دلچسپی اور ہمدردی پیدا ہو گئی اور اس زمانہ میں صحیح اور حقیقی طور پر قومی کالج میں قوم کی آواز کا اثر ہونے لگا۔

۱۹۰۷ء کی مشہور اسٹرائک کو بہت تھوڑا زمانہ گزرا تھا نواب صاحب طلباء کے خیالات سے
واقف تھے اس لئے انھوں نے جائزہ لیتے ہی طلباء سے صاف طور سے کہہ دیا تھا کہ
"میں کالج کا ڈسپلن فوجی کیمپ کے ڈسپلن کی طرح دیکھنا پسند کرتا ہوں اور بورڈنگ ہاؤس
کے تمام کمروں کو خالی دیکھنا بہ نسبت اس کے زیادہ پسند کروں گا کہ ان میں نافرمان اور
ضابطہ کی پابندی نہ کرنے والے طلباء آباد ہوں" لیکن ساتھ ہی وہ ڈسپلن کو صرف طلباء
پر محدود نہ رکھتے تھے بلکہ وہ اسٹاف کو بھی ڈسپلن کے دائرہ میں دیکھنا چاہتے تھے اور
ان کے نزدیک ڈسپلن اسی وقت شگفتگی کے ساتھ قایم رہ سکتی تھی جب کہ اسٹاف اور طلباء
دونوں پابند ہوں اسی لئے انھوں نے اسٹاف کے ڈسپلن پر بھی پوری توجہ رکھی۔
عرصہ دراز سے کالج کا یوروپین اسٹاف تمام معاملات پر حاوی تھا اور اس نے ٹرسٹیوں
کی جماعت پر پورا اقتدار حاصل کر لیا تھا اور نواب محسن الملک بعض اہم مصالح کی بنیاد پر اس
اثر و اقتدار کو برابر تسلیم کرتے رہے تھے۔ مسٹر ماریسن کے بعد مسٹر آرچبولڈ نے ان روایات
اور اس اثر و اقتدار کو نہ صرف قایم رکھا بلکہ ان میں اور اضافہ کیا۔ ان کو آنریری سکریٹری
یا بالفاظ دیگر ٹرسٹیز کی نگرانی بھی گوارا نہ تھی۔ آنریری سکریٹری سے ملنا یا مل کر کام کرنا تکلیف
کا باعث تھا اور اس کو وہ اپنے رعب و داب کے منافی سمجھتے تھے۔ آنریری سکریٹری
نے چارج لینے کے بعد طلباء، و اسٹاف اور دیگر انتظامات کالج کے متعلق اپنے قانونی
اختیارات کا استعمال کیا جو مسٹر آرچبولڈ کو بہت شاق گزرا اور انھوں نے واقعی اور
بغیر واقعی امور کو وجہ شکایات قرار دے کر ایک زبردست پروٹسٹ کیا اور ہز آنر سر

جان ہیوٹ لفٹنٹ گورنر دیپرن کالج، کو بھی اطلاع دی۔ یوروپین ممبران اسٹاف نے
بھی ایک مشترکہ احتجاجی یادداشت پیش کی جس میں ظاہر کیا گیا تھا کہ "اب وہ وقت آگیا
ہے کہ گورنمنٹ کالج کے معاملات میں دخل دے" اس احتجاج نے ایک نہایت پیچیدہ
بلکہ خوفناک صورت حالات پیدا کر دی۔ ہزآنر نے بحیثیت مربی کالج معاملات میں
مداخلت کی سکریٹری اور پرنسپل سے بالمشافہ گفتگوئیں کیں لیکن ہنوز کوئی مختتم فیصلہ نہیں ہوا
تھا کہ ان واقعات کی اشاعت سے تمام قوم میں ایک عام ہیجان پیدا ہو گیا اور پشاور
سے لے کر مدراس تک کوئی ممتاز شہر ایسا نہ تھا جس میں قوم نے آنریری سکریٹری پر
اظہار اعتماد کر کے اس رائے کا اظہار نہ کیا ہو کہ سکریٹری کے ہاتھ قوی کئے جائیں
اور کالج پر قومی نگرانی قایم رہے۔

ٹرسٹیوں کی کثیر جماعت نے بھی حمایت و تائید کی اور اس موقع پر خاص دلچسپی
و سرگرمی کا اظہار کیا متعدد اجلاس منعقد ہوئے اور بالآخر اعلان کر دیا گیا کہ آنریری سکریٹری
کی کارروائیاں حدود اختیارات اور قانون کے اندر تھیں اور ان کو ان عام اختیارات
سے محروم نہیں کیا جا سکتا پرنسپل کی اس کارروائی کے متعلق کہ انھوں نے براہ راست ہزآنر سے
مراسلت کی اظہار ناراضی کیا گیا اور ان کا استعفا منظور کر لیا گیا اور چونکہ اسٹاف نے
اپنا جائنٹ نوٹ واپس لے لیا تھا اس لئے اس کو نظر انداز کر دیا گیا۔ ہزآنر آنریبل سرجان
ہیوٹ لفٹنٹ گورنر و پیٹرن کالج نے اپنے مفید مشوروں سے نہایت مدد پہنچائی اور
ٹرسٹیوں کی رائے کے ساتھ اتفاق کیا اس کارروائی کا یہ نہایت مفید نتیجہ نکلا کہ یوروپین

اسٹاف کو اپنے فرائض کے حدود معلوم ہوگئے اور اس کا اثر و اقتدار ایک مناسب حد تک محدود ہوگیا لیکن با وجود اس شدید اختلاف کے بھی نواب صاحب کی خاص عظمت مسٹر آرچبولڈ کے دل میں قائم تھی۔ یہ عظمت کیوں قائم تھی؟ اس کا جواب انھیں کے قلم سے زیادہ دلچسپ ہوگا:۔

نواب وقارالملک مرحوم سے مجھے ہمیشہ دلچسپی رہی ہے وہ پرانے خیالات کے آدمی تھے لیکن ارادہ میں پکے دیانت دار اور اعلیٰ کریکٹر کے شخص تھے وہ نئے طریقوں اور نئے خیالات سے زیادہ واقف نہ تھے اس لئے ایم او کالج علی گڑھ جیسی تعلیم گاہ کے معاملات میں ان کو دشواری پیش آتی تھی باوجود اس واقعہ کے اور با وجود اس امر کے کہ میں نے اپنے عہدہ کو محض اس وجہ سے ترک کردیا کہ کالج کے انتظامی معاملات میں میرا ان کے ساتھ بنا ممکن نہ تھا میں نے ہمیشہ ان کی عزت کی بلا شبہ میں نے اکثر یہ خیال کیا کہ مجھے کبھی کسی دوسرے ہندوستانی شخص سے ملنے کا موقع نہیں ملا جو اس درجہ مضبوط کریکٹر کا ہو، جس انہماک سے انھوں نے اپنے عیش و آرام کو قربان کر کے قوم کی خدمت کی ہے وہ کسی طرح چھپائی نہیں جاسکتی۔ اگر ضرورت ہو تو میں ان تعلقات کو جو میرے ان کے ساتھ بسلسلۂ کالج تھے تفصیلی طور پر بیان کرسکتا ہوں لیکن ایسے واقعات اختلاف آرا کا باعث ہوسکتے ہیں اس لئے نظر انداز کردینا بہتر ہے۔ مجھے پرانے جھگڑوں کے اعادہ کا افسوس

ہوگا۔ متعدد وجوہ سے وہ ایک اعلیٰ معتمرہستی تھی جس نے ہمیشہ ہر معاملہ میں
صداقت کے ساتھ جنگ کی میری تمنا ہے کہ فی زمانہ نواب صاحب کی قوم میں
اُن جیسے اور افراد بھی ہوں عام اس سے کہ ان کی رائے غلط ہو یا درست وہ
نہایت دیانت داری سے غور و فکر کرتے تھے۔"

نواب صاحب کے سامنے اب ایک اہم مسئلہ پرنسپل کی جگہ معمور کرنے کا تھا اسٹاف
کے تمام ممبر اگرچہ جائنٹ نوٹ واپس لے چکے تھے مگر چونکہ ان کی اس کارروائی سے
دلوں کو تکلیف پہنچی تھی اس لئے ان میں سے کسی کا تقرر احتیاط کے خلاف تھا مگر نواب صاحب
نے اس اصول پر کہ اعتراف غلطی کے بعد اس کو بھلا دینا ہی بہتر ہے مسٹر ٹول کو جو سب سے
سینیر تھے انتخاب کیا اور ٹرسٹیوں نے جو پالیسی قرار دی تھی اس کی متابعت کا ایک
صاف اقرار ان سے حاصل کر کے اس عہدہ پر ان کو مامور کرایا۔

مسٹر ٹول کے انتخاب کے وقت جو امید کی گئی تھی وہ پوری ہوئی اور انھوں نے
آخر تک ہم آہنگی اور آنریری سکریٹری کے اختیارات اور مرتبہ کو ملحوظ رکھ کر اپنے فرائض
انجام دیئے۔

طلباء کو علی العموم ڈیوٹی اور کالج فنڈ سے وظائف دیئے جاتے تھے جو دراصل ایک
قسم کی خیرات تھی اس لئے اس سے غیرت و حمیت پر بھی بُرا اثر پڑتا تھا جو قومی کریکٹر کے
لئے نہایت مضر تھا۔ نواب صاحب نے ان وظیفوں کا دینا قطعی بند کر کے قرض حسنہ
کا طریقہ قائم کیا اور کالج سے جو وظائف پرنسپل کے ذریعہ سے دیئے جاتے تھے ان کا

تعلق سکریٹری سے رکھا تاکہ طالب علم کھلے دل سے اپنی قوم کے آدمی کے سامنے بطور راز کے اپنے خانگی حالات کو ظاہر کر سکے۔

کالج کی وسعت اور طلباء کی کثرت کے ساتھ اساتذہ کی تعداد کا اضافہ بھی ہوتا رہا اور ہندوستانی اور یوروپین پروفیسروں کی درجہ بندی کی اسکیم منظور کی گئی اور یوروپین اسٹاف میں ان ہندوستانیوں کو بھی شامل کیا گیا جنھوں نے کامیابی کے ساتھ ولایت میں تعلیم پائی ہو۔ کالجیٹ اسکول کے مدرسوں کو ٹریننگ کالج میں بھیجنے کا انتظام کیا گیا تاکہ اسکول کی تعلیم ٹرینڈ ٹیچروں کے ذریعہ سے ہو۔ قابل نوجوانوں کو کالج فنڈ سے یورپ کی یونیورسٹیوں میں تکمیل علوم کے لئے بھیجنے کا سلسلہ شروع کیا جن کے ساتھ یہ معاہدہ کیا گیا کہ واپسی کے بعد وہ کالج کی خدمات انجام دیں، اسی کے ساتھ کالج میں فیلوشپ بھی قایم کی، انجینرنگ اور ڈاکٹری کے وظائف جاری کئے اور سائنس کے شعبہ کو ترقی دی

نواب صاحب نے ہمیشہ بورڈوں کی مذہبی تعلیم اور اعمال مذہب کی پابندی پر زیادہ توجہ رکھی اور اسی غرض سے ہر علٰحدہ بورڈنگ ہاؤس کے متعلق ایک پیش امام اور معلم دینیات کا تقرر کیا گیا اور پانچوں وقت نماز کی حاضری لازم کی گئی۔ طلباء کی طبی امداد کو وسیع پیمانہ پر لانے کے لئے ایک یونانی دواخانہ کا قیام اور یونانی طبیب اور اسسٹنٹ سرجن کا تقرر بھی عمل میں آیا طلباء کی تعداد میں غیر متوقع اضافہ ہوا اور سنہ ۱۹۱۱ء میں تعداد ایک ہزار سے متجاوز ہو گئی اور سنہ ۱۹۱۲ء میں بورڈنگ ہاؤسوں کا انتظام نہ ہونے کے باعث سات سو درخواستیں مسترد کرنی پڑیں۔

تعلیمات کی طرف بھی توجہ کی منٹو سرکل تعمیر ہوا اور اسٹاف کے لئے ضروری مکانات تیار کئے گئے۔

نواب صاحب نے باوجود عوارض اور ضعیف العمری کے متعدد دورے کئے کراچی اور رنگون تک کا سفر کیا۔ رامپور میں ہز ہائی نس نواب صاحب بہادر سے اور بھوپال میں علیا حضرت سرکار عالیہ دام اقبالہا سے شرفِ نیاز حاصل کر کے کالج کے حالات اور قومی ضروریات کو گوش گزار کیا۔

ہز اکسلنسی لارڈ منٹو وائسرائے و گورنر جنرل اور صوبہ متحدہ کے لفٹنٹ گورنروں، مہاراجہ کشمیر، نواب صاحب بہادر رامپور، ہز ہائی نس میر خیرپور سندھ، چیف کمشنر صوبہ سرحدی، نواب صاحب ڈھاکہ، سیٹھ عبدالکریم عبدالشکور جمال برادرس ملک التجار رنگون اور بعض دیگر اکابر قوم نے کالج کا باضابطہ معائنہ کیا۔

علیا حضرت سرکار عالیہ فرماں روائے بھوپال نے بالکل پرائیویٹ طور پر کالج ملاحظہ فرمایا، حضور وائسرائے نے ایڈریس کے جواب میں جو تقریر فرمائی اس میں آنریری سکریٹری کو "نواب" کا خطاب مرحمت فرمایا اور اپنے دست خاص سے اس کی سند عطا کی۔

ان جلیل القدر وزیٹروں کی تشریف آوری سے گراں قدر مالی فوائد بھی حاصل ہوئے ہز اکسلنسی کی تشریف آوری کی یادگار میں ایک وسیع اور عظیم الشان بورڈنگ ہاؤس منٹو سرکل کے نام سے تعمیر کیا جانا تجویز ہوا۔

ہز ہائی نس نواب صاحب رامپور نے حامد ہال کی تعمیر کے لئے دس ہزار روپیہ

عنایت کیا اور حضور ممدوح نے اپنی توجہ اور کوشش سے ہز ہائی نس مہاراجہ گوالیار سے سائنس کالج کی ترقی کے لئے ایک لاکھ روپیہ دلوایا۔ جمال برادرس رنگون نے باون ہزار چار سو پچاس ۵۲۴۵۰، نواب کرنل حافظ محمد عبید اللہ خان بہادر سی ایس آئی محسن الملک بھوپال اور راجہ صاحب ناپارہ نے پچاس پچاس ہزار روپیہ اور نواب یار محمد خاں وزیر جاورہ اور سر راجہ تصدق رسول خاں (جہانگیر آباد) نے چالیس چالیس ہزار روپئے عطا کئے۔ مہاراجہ بہادر محمود آباد، آنریبل سر فاضل بھائی نے دس دس ہزار روپئے عنایت کئے۔ ہز ہائی نس نواب صاحب جوناگڈھ نے پچیس ۲۵ ہزار کا عطیہ دیا۔ ہز ہائی نس میر خیر پور نے پانچ ہزار نقد کے علاوہ دو ہزار روپئے سالانہ بارہ سال کے لئے مقرر کئے۔

ان رقوم کے علاوہ علیا حضرت سرکار عالیہ فرماں روائے بھوپال نے پانچ ہزار روپئے سالانہ کی گرانٹ عطا فرمائی اور ہز ہائی نس آغا خاں نے اپنی گرانٹ میں اضافہ کیا۔ جمال برادرس نے سو روپیہ ماہانہ مقرر کیا۔ بھیرایوں میں ایک خاتون نے اور کرنال میں نواب صاحب کرنال نے اپنے اوقاف میں کالج کا حصہ رکھا۔

نواب صاحب نے یہ کوشش بھی کی کہ گورنمنٹ آف انڈیا کالج کی مرکزی حیثیت تسلیم کرے اور اس کو گورنمنٹ آف انڈیا سے امداد ملے۔ چنانچہ اس کے متعلق مراسلت کی اور نتیجہ میں مرکزی گورنمنٹ سے دو لاکھ روپیہ حاصل ہوا۔ صوبہ کی گورنمنٹ نے سائنس لیبارٹیری کے لئے بیس ۲۰ ہزار روپیہ دیا۔ ان یکمشت امدادوں کے علاوہ مستقل آمدنی میں بھی کافی ترقی ہوئی۔ چنانچہ ۱۲-۱۹۱۱ء میں کل آمدنی دو لاکھ تیس ہزار تھی اور خرچ دو ۲ لاکھ

چھبیس ہزار پانچسو پچیس تھا۔

ان فوائد کے ساتھ نواب صاحب کے زمانہ میں کالج کو سب سے زیادہ مہتم بالشان فائدہ جو گوناگوں فوائد کا سرچشمہ ہے یہ پہنچا کہ بھوپال سے پرنس حمیداللہ خاں بہادر لفٹنٹ کرنل افتخار الملک سی ایس آئی سی وی او بحیثیت ایک طالب علم کے کالج میں داخل ہوئے نواب صاحب کو اندرونی اصلاحات سے ایک گونہ دلجمعی ہوئی تھی اور وہ کالج کی مالی حالت اور اس کے متعلق شعبوں کی ترقی کی تدابیر میں مصروف تھے کہ دسمبر ۱۹۱۰ء کی آخری تاریخوں میں جب کہ ناگپور میں کانفرنس کا اجلاس ہو رہا تھا ہز ہائی نس آغا خاں نے اعلیٰ حضرت ملک معظم قیصر ہند کے ورود ہندوستان کے موقع پر محمڈن یونیورسٹی کے قیام کی امید دلائی اور تحریک کی ہے جس قدر سرگرمی کے ساتھ ممکن ہو اس کے لئے چندہ فراہم کیا جائے۔ چنانچہ جنوری میں بمقام علی گڑھ نواب صاحب کی کوٹھی پر ہز ہائی نس کی صدارت میں ایک ابتدائی جلسہ مشاورت منعقد ہوا جس میں فراہمی سرمایہ کے لئے ایک مقتدر کمیٹی قایم کی گئی۔ ہز ہائی نس آغا خاں پریسیڈنٹ اور مختلف صوبوں میں ممتاز مشاہیر اصحاب وائس پریسیڈنٹ قرار پائے اور نواب صاحب سنٹرل کمیٹی کے سکریٹری منتخب ہوئے۔ ہر صوبہ میں پراونشل کمیٹیاں قایم ہوئیں اور سنٹرل کمیٹی کا ایک علحدہ دفتر قایم کیا گیا۔

یونیورسٹی کی اس تحریک کا تعلق چند ہی دنوں میں تمام ہندوستان سے ہو گیا اور جس قدر اس تحریک کا اثر پھیلتا جاتا تھا اسی نسبت سے مصروفیتوں میں بھی اضافہ

ہوتا جاتا تھا۔ اپیلوں کی تیاری، اخبارات کے مضامین، عام و خاص خطوط کا انبار اور
پھر ڈیپوٹیشنوں میں شریک ہو کر مختلف مقامات کا دورہ اور ہر جگہ مقامی اصحاب سے تبادلۂ
خیالات متعدد کمیٹیوں میں شرکت، شملہ میں حکام تعلیم سے ملاقاتیں اور گفتگوئیں اور یونیورسٹی
کے کانسٹی ٹیوشن پر بحث و مباحثہ پبلک کے اطمینان اور غور کے لئے بعض مضامین اور
مسودات کی اشاعت اخباری اعتراضات اور مضامین کے جوابات اتنا زبردست اور
عظیم الشان کام تھا کہ صرف وقار الملک ہی کی طاقت و ہمت تھی کہ انھوں نے اس پیرانہ
سالی اور عوارض لاحقہ کی حالت میں یہ بار اپنے شانوں پر اٹھایا اور اس میں شک نہیں
کہ ان پر جو عام اعتماد تھا اس کے باعث تحریک کو بڑی تقویت پہنچی۔ جدید تعلیم یافتہ گروہ
کے علاوہ علماء اور صوفیاء کرام نے بھی کوششوں میں حصہ لیا چندہ میں جس طرح والیان ملک
امراء اور تجار نے لاکھوں اور ہزاروں روپئے عطا کئے اسی طرح غرباء اور مزدوروں
تک نے آنے اور پیسے پیش کئے اور ۳۰ جولائی ۱۹۱۲ء تک یعنی ڈیڑھ سال میں چھبیس ۲۶ لاکھ
انتیس ۲۹ ہزار چار ۴ سو ترسٹھ ۶۳ روپیہ نقد جمع ہو گیا تین ۳ لاکھ چھتیس ہزار سرمایہ وظیفۂ دوامی میں حاصل ہوا
اور پینتیس ۳۵ ہزار ایک سو ترسٹھ روپیہ پراونشیل کمیٹیوں کی تحویلات میں موجود تھا۔

وعدوں کے بعد چندوں کی وصولی بھی نہایت سخت کام ہوتا ہے اور پھر جب کہ
اس کا تعلق ہندوستان کے گوشہ گوشہ سے ہو۔ نواب صاحب نے اس معاملہ میں بھی
خاص کوشش کی لیکن انھوں نے اس تجویز کے ابلاغ میں کہ تمام ٹرسٹی اور اولڈ بوائز اور کانفرنس
کی سنٹرل اسٹینڈنگ کمیٹی کے ممبر اپنی ایک ماہ کی آمدنی یونیورسٹی فنڈ میں دیں جب تک اپنا

چندہ ادا نہیں کر دیا کسی شخص پر تقاضا نہیں کیا اور نہ تقاضے کے کسی کاغذ پر دستخط کئے۔

ان تمام اخلاقی اور مادّی فوائد کے لحاظ سے بلا خوف تردید ان کے زمانہ کو عصر طلائی سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

لیکن ان کی تندرستی پر اس محنت شاقہ کا بہت سخت اثر پڑا۔ انھوں نے جس وقت آنریری سکریٹری کے عہدہ کو قبول کیا ہے صاف طور پر کہہ دیا تھا کہ "میرے لئے کام کرنے کا وقت گزر چکا ہے، عمر انحطاط پر ہے، قوے کمزور ہو گئے ہیں اور بعض عوارض بھی لاحق ہیں میرا وقت مکان پر رہنے اور آرام و استراحت کرنے کا ہے مگر میرے عذرات کی سماعت میرے دوستوں اور بزرگوں نے نہیں فرمائی اور انھوں نے مجھے مجبور کیا کہ میں اس ذمّہ داری کے عظیم الشان کام کو قبول کروں ان کے عنایت آمیز اصرار کا جواب نفی میں دینا اور ان کی آزردگی کا باعث بننا میرے لئے ناممکن تھا مجبوراً میں نے اس بوجھ کو اپنے کندھوں پر اُٹھایا۔" اب اگرچہ نواب سر محمد فرمل اللہ خاں بہادر کے سی ایس آئی ان کے سرگرم اور قابل جائنٹ سکریٹری اپنے وسیع کاروبار اور راحت و آرام کو قربان کرکے کامل انہماک کے ساتھ ان کی معاونت کرتے رہتے تھے اور باہمی اعتماد و اطمینان بھی تھا۔ نواب صاحب کی بہتر سال کی عمر ہو چکی تھی امراض کا حملہ جلد جلد اور تیز تر ہوتا تھا اور وہ پورے طور پر اپنے عہدہ کے فرائض کو جو ان کی ذات پر عائد تھے انجام نہیں دے سکتے تھے اس لئے انھوں نے اس عہدہ پر رہنا دیانت کے خلاف سمجھا اور استعفا پیش کرکے اصرار کے ساتھ منظور کرا لیا اور ۱۲ اگست ۱۹۱۲ء کو ساڑھے چار سال سخت انہماک اور قومی درد کے ساتھ

ان خدمات و فرائض کو انجام دے کر سبکدوش ہو گئے۔ ٹرسٹی صاحبان نے استعفا منظور کرتے ہوئے ایک بہت طولانی رزولیوشن میں نواب صاحب کی خدمات کا اعتراف کیا، اور آخر میں یہ جملہ تحریر کیا کہ :-

"کالج کو جس درجہ پر ہر اعتبار سے ترقی اور اعتماد عام کی حالت میں جناب ممدوح نے اس وقت چھوڑا ہے وہ اس سے بدرجہا زیادہ ہے جب کہ جناب ممدوح نے اس کا چارج بحیثیت آنریری سکریٹری لیا تھا۔"

تمام پبلک نے بھی عام طور سے افسوس کیا اور ہر طرف ان کے عظیم الشان کاموں اور بے لوث خدمات کی شکر گزاری کی گئی۔

یہاں ہم مسٹر ٹول کے ایک خط کا اقتباس بھی مناسب سمجھتے ہیں جن کو ایک ناگوار واقعہ کے بعد ان کے ساتھ عرصہ تک کام کرنے کا تجربہ ہوا تھا:-

"نواب وقار الملک با اخلاص مذہب کے پابند اور بڑے زبردست کریکٹر کے شخص تھے ان کو زمانہ کا اور آدمیوں کا بڑا تجربہ تھا اور اس میں وہ اس وقت کامل ثابت ہوئے جب کہ ان کو اہم معاملات پیش آئے۔ ان کا استقلال بڑا زبردست تھا وہ ایسی عمر میں بھی محنت سے کام کرتے تھے جب کہ اکثر لوگ مشکل سے کام کرنا بھی پسند کرتے ہیں وہ اپنی قوم کی ترقی اور کالج کی بھلائی میں انتھک قوت عمل سے کام لیتے تھے باوجود کریکٹر کی اس طاقت اور ارادہ کی مضبوطی کے ان کی طبیعت نرمی کا پہلو لئے ہوئے تھی۔

ان کو بچوں سے بہت زیادہ انس تھا اور ان میں ہر وقت گھرے رہنے کو
پسند کرتے تھے ان کی جدائی سے قوم ایک لیڈر اور کالج ایک سرگرم کارکن سے
محروم ہو گیا جس کی تلافی دشوار ہے۔

(۱۳)

۱۹۱۱ء و ۱۲-۱۹۱۳ء میں جنگ طرابلس و بلقان، ایران میں روسی فوج کا داخلہ تقسیم بنگال کی
تنسیخ، یونیورسٹی کے متعلق خلاف امید گورنمنٹ کے اعلانات و مراسلات، کانپور کی مسجد کا
انہدام، یہ چند ایسے واقعات تھے جن سے مسلمانوں میں ایک زبردست ہیجان پیدا ہو گیا
تھا ہر دل میں رنج و غم کی لہریں دوڑ رہی تھیں اور عام مایوسی چھائی ہوئی تھی۔ نواب صاحب
بھی ان حالات و واقعات سے متاثر تھے۔ ممالک اسلامیہ کے متعلق ابتدا سے ہی وہ اپنے
سابق جانشینوں کے خیالات سے مختلف خیالات رکھتے تھے اور کبھی انھوں نے اس
مذہبی ہمدردی کو جو ان ممالک کے ساتھ تھی کسی مصلحت سے مخفی نہیں رکھا۔ انھوں نے
کالج میں طرابلس کے چندہ کی عام اجازت دی اور سب سے پہلے اپنا چندہ پیش کیا اور جب
طلبا نے ایک وقت کا گوشت وغیرہ چھوڑ کر اس کی بچت کو فنڈ میں دینے کی تجویز کی تو اس
تجویز پر سب سے پہلے خود انھوں نے عمل کیا۔ اسی طرح انھوں نے عید کی مبارکبادیوں کے جواب
تار پر دینے کی جگہ خطوط سے دیئے اور جو روپیہ کہ تاروں میں خرچ ہوتا اس کو مصیبت زدگان
طرابلس کے امدادی چندہ میں جمع کرایا۔

دسمبر ۱۹۱۱ء میں الحاق بنگالین اور تنسیخ تقسیم کے اعلان شاہی کے بعد جو بنگالیوں کے استقلال اور ایجی ٹیشن کا نتیجہ تھا انھوں نے اس مایوسانہ حالت کا اندازہ کرکے جس کی وجہ سے بعض مسلمانوں کو کانگریس میں شرکت کا خیال پیدا ہوگیا تھا ایک مضمون کے ذریعہ سے اپنی پولٹیکل پالیسی کو صاف اور نمایاں طور پر ظاہر کردیا۔ اس مضمون میں انھوں نے الحاق سے جو مسلمانوں کے حق میں مضر اثرات تھے ان کو دکھا کر لکھا کہ :۔

"جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے یہ عام رائے سمجھنی چاہئے کہ یہ الحاق عام طور پر ناپسند کیا جاتا ہے اور بعد اس کے کہ بذریعہ سلطنت تنسیخ کے بعد دیگر الحاق کے خلاف امیدیں دلائی تھیں، الحاق کا عمل میں آنا گورنمنٹ کی کمزوری اور آئندہ اس کے قول وفعل کی بے اعتباری کی ایک وجہ قرار دی جائے گی اور اس لئے اگر ایسا نہ ہوتا تو بہتر تھا..... لیکن اس سے ہم کو قطعی اختلاف ہے کہ اپنے قومی شیرازہ کو منتشر کرکے ہم دوسرے زبردست گروہ کے ساتھ اسی طرح شامل ہوجائیں جس طرح کوئی دریا سمندر میں شامل ہوکر اپنی ہستی کو معدوم کردیتا ہے۔ ہماری علٰحدگی کانگریس وغیرہ سے اس بنا پر نہیں ہے کہ ہم کو گورنمنٹ کے ساتھ وفادار رہنا چاہیئے۔ وفاداری خود غرضی ہے وہ جوہر نہیں ہے اس کی بنیاد بھی کسی اور چیز پر قائم ہوتی ہے اور جس قدر اس بنیاد میں تزلزل ہوگا وفاداری بھی لامحالہ متزلزل ہوگی۔ پس مسلمان بحیثیت قوم نیشنل کانگریس سے اب تک علٰحدہ ہیں اس کی بنیاد یہ ہے کہ کانگریس کے بعض

اہم دعاوی مسلمانوں کے حق میں مضرت بخش ہیں۔ ان کا سوراج مسلمانوں
کے حق میں تباہ کن ہے۔ برٹش گورنمنٹ کا سایہ ہندوستان سے اٹھنا یا اس کا
اثر بہت کم رہ جانا مسلمانوں کے حق میں بربادی بخش ثابت ہوگا یعنی ایک
ہی چیز جو ہمارے ابنائے وطن کے حق میں خوش قسمتی سمجھی جا سکتی ہے
مسلمانوں کے حق میں (جن کی مردم شماری اس ملک میں کم ہے) وہ سم قاتل
ہے۔ مشرقی اور مغربی بنگال کے الحاق کا جو بھی نتیجہ نکلا اس سے مذکورہ بالا
کلیہ باطل نہیں ہوتا۔ اگر ہمیں ہندوستان میں رہنا ہے تو برٹش گورنمنٹ سے
بگاڑ کر رہنا یہ ہمارے لئے ٹھیک نہ ہوگا۔ گورنمنٹ کے استحکام میں کوشش
کرنا اور اس کے ساتھ شریک رہنا یہ خود ہم کو اپنے استحکام میں کوشش کرنا ہے
لہذا اس قسم کے خیالات سے ہم کو احتراز کرنا چاہیئے۔ یہ سچ ہے کہ بسا اوقات
مایوسیاں انسان کو خودکشی پر آمادہ کر دیتی ہیں اور یہ خیال کہ اب ہم کو کانگریس
کے ساتھ شامل ہو جانا چاہیئے اس قسم کی مایوسیوں کا نتیجہ ہے کہ جس کی ذمہ دار
موجودہ گورنمنٹ ہے لیکن خودکشی کی صلاح کسی وقت میں بھی نہیں دی جا سکتی
لامحالہ ہم کو سوچنا پڑتا ہے کہ آئندہ ہم کو کیا طریقہ اختیار کرنا چاہیئے ...... یہ تو
آفتاب نصف النہار کی طرح اب روشن ہے کہ ان واقعات کے دیکھنے کے
بعد جو اب مشاہدہ میں آئے، یہ مشورہ دینا کہ مسلمانوں کو گورنمنٹ پر بھروسہ
کرنا چاہیئے لاحاصل مشورہ ہے اب زمانہ ایسے لاحاصل بھروسوں کا نہیں رہا

خدا کے فضل و کرم کے بعد جس چیز پر ہم کو بھروسا کرنا چاہیئے اور وہ ہماری اپنی قوتِ بازو ہے اور اس کی نظیر جو ہمارے قابل ابنائے وطن نے پیش کی ہے ہمارے سامنے موجود ہے۔"

اس کے بعد ان تدابیر کو بیان کر کے جن پر مسلمانانِ بنگال کو فوراً کار بند ہونا چاہیئے تعلیمی کوششوں کو وسیع اور قوی کرنے پر زیادہ زور دیا۔ اس الحاق سے مسلمانانِ بنگال کو جو نقصان پہنچا اور مسلمانوں کے حقوق کو جس طرح نظر انداز کیا گیا اس سے وہ بہت متاثر تھے۔ انھوں نے اپنے ایک دوست کو خط لکھتے ہوئے اس اثر کو یوں ظاہر کیا ہے کہ:-

"کم از کم مسلمانوں کا یہ کام تو ضرور ہے کہ ایک مضبوط کوشش کے ساتھ بتلا دیں کہ گورنمنٹ کی طرف سے مسلمانوں کے ساتھ یہ بے اعتنائی مسلمانوں میں نہایت مایوسانہ خیالات سے دیکھی گئی ہے کہ دونوں بنگالہ کے الحاق کے ساتھ گورنمنٹ نے مطلق بھی اس کی ضرورت نہ سمجھی کہ ساتھ ہی ساتھ مسلمانوں کو اطمینان دلایا جاتا کہ ان کی ترقی پزیر حالت اور حقوق کی حفاظت فلاں فلاں ذریعہ سے کی جائے۔ گورنمنٹ کی یہ پالیسی بمنزلہ ایک توپخانہ کے تھی جو مسلمانوں کی مُردہ لاشوں پر سے گزر گیا، بدوں اس احساس کے کہ ان غریب لاشوں میں سے کسی میں کچھ جان باقی ہے اور ان کو اس سے کوئی تکلیف محسوس ہوگی اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔ کس کا مرکو اور کس کی ٹرویولی اور کہاں کا ایران یہاں سرے سے اسلام ہی کا

قلع قمع ہوا جاتا ہے۔ ولعل اللہ یحدث بعد ذلک امرا۔"

اسی زمانہ میں روسی فوج ایران میں داخل ہوگئی تھی۔ برطانیہ نے بھی اپنے فوائد کی حفاظت کے لئے اپنی فوجیں اتاری تھیں اور اس طرح ان دونوں طاقتوں کے درمیان ایران کے پس جانے کا خطرہ پیدا ہوگیا تھا۔ ایران کے علاوہ ٹرکی اور افغانستان بھی زد پر تھے۔ نواب صاحب نے ان حالات کے متعلق بھی نہایت آزادی کے ساتھ اپنے جذبات وخیالات کو اس طرح ظاہر کیا کہ:۔

" اسی کے ساتھ جب مسلمان دیکھتے ہیں کہ مراکو فرانس کے پنجہ میں گرفتار ہوگیا اور ٹونس پہلے ہی سے مسلمانوں کے قبضہ سے نکل کر فرانس کے قبضہ میں ہے، طرابلس پر اٹلی نے مصیبت ڈھا رکھی ہے، مصر انگریزی قبضہ میں ہے تو ایسی حالت میں ایران پر جو کارروائی اب روس وانگلستان کی طرف سے ہو رہی ہے اس کے لحاظ سے اگر مسلمان یہ خوف کرتے ہیں کہ یورپ کی سلطنتوں نے اسلامی حکومتوں کے مقابلہ کے واسطے باہم کوئی قرارداد کرلی ہے تو ان کا یہ خوف کچھ بے جا نہیں ہے اور اس خوف کے بعد جو پریشانی مسلمانوں میں نہ ہو وہ کم ہے ...... اب یہ مسئلہ ہندوستان کے مسلمانوں میں شیعہ اور سُنّی کا مسئلہ نہیں رہا۔ ہندوستان کے تمام مسلمان خواہ وہ شیعہ ہوں یا سُنّی ہوں ان کو ایران کے ساتھ اب یکساں ہمدردی ہے اور ہونی چاہئیے۔"

اس کے بعد وزراء کی پالیسیوں پر بحث کرکے لکھا کہ:۔

"ہم پھر کہتے ہیں اور بتاکید کہتے ہیں کہ اس موقع پر مسلمانوں کو کامل اتحاد
کے ساتھ ایران کی ہمدردی کا اظہار کرنا چاہیئے جس میں شیعہ اور سُنّی کا
کوئی نام نہ آنے پائے۔"

پھر تمام معاملات پر بحث کی ہے اور مسلمانوں کو مشورہ دیا ہے کہ وہ اظہار ہمدردی کا
جو طریقہ اختیار کریں اس کو علی الاعلان عمل میں لائیں۔ اور آخر میں لکھتے ہیں کہ:۔

"جب انسان کا دل بھرا ہوتا ہے تو بات لمبی ہو ہی جاتی ہے، اس
وقت ایران کی حالت اور اس کے انجام کا جس وقت تصوّر بندھ جاتا ہے
تو خدا ہی جانتا ہے کہ دل کی کیا کیفیت ہوتی ہے مگر مایوس کسی وقت نہ ہونا
چاہیئے۔ ومن بعد ما قنطوا ینشر رحمته کو ورد زبان رکھنا
چاہیئے۔ مضطر کی دعا خدا جلد قبول کرتا ہے۔ کیا عجب ہے کہ پردہ غیب سے
اب بھی کچھ ایسے اسباب مہیا ہوں جو مسلمانوں کے عام اطمینان کا باعث ہو جائیں۔"

یہ مضامین اگرچہ انھوں نے آنریری سکریٹری کالج کی حیثیت سے نہیں لکھے لیکن اُسی
زمانہ میں لکھے جب کہ وہ کالج کے آنریری سکریٹری تھے اور انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں شائع
ہوئے تھے جو کہ بعد کو ہندوستان کے تقریباً ہر اخبار میں نقل کئے گئے یہ پہلے مضامین
تھے جن کو ایک ذمہ دار اور با اثر لیڈر نے قدیم پالیسی سے متجاوز ہو کر لکھا لیکن حقیقت
یہ ہے کہ حقیقی لیڈر اور رہنما کی عین شان کے مطابق تھے اور کوئی شک نہیں کہ مسلمانوں
کی پولٹیکل پالیسی پر ان مضامین سے بہت اثر پڑا۔

آنریری سکریٹری کے عہدہ سے مستعفی ہوئے پر کالج اور مسلم یونیورسٹی کی تحریک سے ان کی دلچسپی بدستور قایم رہی اور اس حد تک جہاں تک صحت نے اجازت دی ان کارروائیوں میں عملی حصہ لیتے رہے

۱۹۱۲ء میں جب کہ گورنمنٹ نے یونیورسٹی کے حلقۂ اثر کو صرف علی گڑھ تک محدود رہنے اور بجائے محمڈن یونیورسٹی کے علی گڑھ یونیورسٹی کا نام تجویز کئے جانے اور نظام اساسی کے بعض حصوں کے متعلق اپنا اعلان صادر کردیا تو اس سے قوم میں ایک سخت ہیجان برپا ہوگیا اور کسی طبقہ کے کسی شخص نے بھی اس اعلان کو بغیر رنج و افسوس کے نہیں دیکھا اور ایسی یونیورسٹی کے قبول کرنے سے انکار کا زیادہ امکان نظر آنے لگا تو نواب صاحب نے اپنی ایک مبسوط رائے قوم کے سامنے پیش کی جس میں گورنمنٹ کے مراسلہ اور اختیاراتِ الحاق اور نام کے مسئلہ اور اس امر پر بحث کرکے کہ اگر باوجود ہر امکانی کوشش کے مجوزہ یونیورسٹی نہ مل سکے تو ایک آزاد "جامعہ اسلامیہ" قایم کیا جائے جس کے ذریعہ سے عورتوں کی اور ایسے گروہوں کی تعلیم کا جو سرکاری ملازمتوں یا ڈگریوں کے خواہاں نہیں اور صرف تعلیم کے خواہاں ہیں، انتظام کیا جائے، مثلاً بڑے بڑے مسلمان امراء، تجار، علماء، اطبا، اور وہ لاکھوں شرفا جو زمانہ حال کی سرکاری تعلیم کے مصارف برداشت نہیں کرسکتے اور مختلف پیشوں، حرفتوں اور خانگی ملازمتوں کے ذریعہ سے اپنی روزی پیدا کرنے پر مجبور ہیں۔ انھوں نے اس تجویز میں ان تمام شعبہ ہائے تعلیم پر بھی بحث کی جو جامعہ اسلامیہ میں قایم کئے جاسکتے ہیں اور ساتھ ہی امیدواران ملازمت

وغیرہ کی تیاری کے لئے محمدن کالج اور اسلامیہ کالج لاہور کو اس جامعہ کا ایک شعبہ بنانے کی تجویز کی اور ذریعۂ تعلیم زبان اردو کو قرار دیا ہے۔ لیکن بعد کو جو واقعات پیش آئے اور جس طرح یونیورسٹی کی تحریک نے ترقی کی اور نواب صاحب اپنی سخت معذوریوں کے باعث پبلک لائف سے کنارہ کش ہو گئے اس لئے اس رائے کو ناممکن العمل قرار دے کر نظر انداز کر دیا گیا حالانکہ حیدرآباد میں جامعہ عثمانیہ نے اور ہندوؤں کی نیشنل یونیورسٹیوں نے اس اسکیم کو قابلِ عمل کر دکھایا اور اگر مولانا محمد علی کا جامعہ اسلامیہ غیر موافق حالات میں قائم نہ کیا جاتا تو اس اسکیم کی ایک زبردست عملی شکل ہوتی۔

بلقان وار کے سلسلہ میں ہلال احمر کے لئے مسلمانوں نے جو چندے کئے نواب صاحب نے اس میں بھی شرکت کی اور اس وقت اگرچہ وہ روپیہ سے تنگ تھے لیکن انھوں نے ایک حقیت فروخت کر کے ایک ہزار روپیہ اس فنڈ میں عطا کیا اور ڈاکٹر مختار احمد صاحب انصاری کے طبی مشن کی ہر طرح حوصلہ افزائی کی اور جب یہ مشن اپنی اسلامی خدمات ادا کر کے واپس آیا اور ۱۹۱۴ء میں اس نے ترکی مجروحین کی امداد کے لئے دہلی میں ترکی اشیا کی ایک نمایش منعقد کی تو نواب صاحب نے اس کا افتتاح کیا اور ایڈریس کے جواب میں ایک حوصلہ افزا اور ہمدردانہ تقریر کی۔ ترکوں کی اس حالت کا ان پر اس قدر زبردست اثر تھا کہ یونیورسٹی کے چندوں پر ہلالِ احمر کے چندوں کو مقدم رکھا چنانچہ اس سلسلہ میں انھوں نے لکھا کہ:۔

"چونکہ اس عرصہ میں مسلمانوں پر ایک مصیبت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا ہے

اور ہم کو طرابلس اور بلقانی جنگ کی وجہ سے سب سے زیادہ ضرورت ہلالِ احمر
کے واسطے چندہ جمع کرنے کی ہے لہذا اس وقت میں صرف یہ عرض کرونگا
کہ جن لوگوں نے مسلم یونیورسٹی کے واسطے چندوں کا وعدہ کیا ہے وہ اپنا
موعودہ چندہ مہربانی سے جلد ادا کردیں کہ "ان العہد کان مسئولاً"
ایفائے عہد کے لئے خداوند تعالیٰ کا سخت حکم ہے۔ باقی کے لئے چندوں کی
میں اس وقت تک یونیورسٹی کے واسطے اپیل نہ کروں گا جب تک کہ ہلالِ احمر
کی ضرورتوں سے قوم کو بوجہ احسن سبکدوشی نہ ہو۔

اس وقت تو جو کچھ کسی سے بن پڑے وہ ہلالِ احمر کے فنڈ میں جمع
کردے جس سے زیادہ کوئی شدید ضرورت بالفعل مسلمانوں کی نہیں ہو سکتی"

سنہ ۱۹۱۳ء میں کانپور کی مسجد کے ایک حصہ کے انہدام کا جو واقعہ ہوا اور مزاحمت
کرنے والے مسلمانوں پر مسٹر ٹائلر کلکٹر نے فیر کرائے جس سے بہت کچھ اتلافِ جان
ہوا اور اس کے بعد مسلمانوں پر مقدمے چلائے گئے تو قوم میں ایک سخت
جوش پیدا ہو گیا۔ نواب صاحب بھی ان واقعات سے سخت متاثر ہوتے اور انھوں نے
اپنی آزادانہ رائے اور اسلامی جذبہ کو علی الاعلان ظاہر کرنے میں تامل نہیں کیا
انھوں نے "کانپور کا ہنگامۂ محشر" کے عنوان سے ایک مضمون لکھا جس میں ان
قانون پیشہ اصحاب کی خدمات کا جنھوں نے ان گرفتار شدہ مسلمانوں کی طرف سے
پیروی کی تھی شکریہ اور ان کی خدمات کا اعتراف کیا اور پھر ایسے واقعات کے

انسداد کے لئے قوم کو یوں توجہ دلائی کہ :-

"بدمزاج سے بدمزاج حاکم بھی زیادہ عرصہ تک اپنی بدمزاجی پر قائم نہیں رہ سکتا۔ اگر رعایا اپنی آزادی کی حفاظت اعتدال و استقلال کے ساتھ کرتی رہے۔ اب جو معاملات کانپور کے متعلق مسلمانانِ صوبہ متحدہ کے سامنے ہیں یہ ایک ایسا موقع ہے کہ اگر ہم نے اس کو بغیر کافی توجہ کے ہاتھ سے جانے دیا تو ایک ٹالر نہیں آئندہ ہم کو توقع رکھنی چاہئے کہ ہر ایک سب انسپکٹر ہمارے لئے ٹالر ثابت ہوگا۔ اگر اس وقت ہم نے اعتدال و استقلال سے کام لیا تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ کوئی بڑے سے بڑا حاکم بھی دفعتہً ہمارے جذبات کے خلاف کارروائی کرنے میں بہت زیادہ احتیاط برتے گا اور اب ہمارے ہاتھ میں ہے کہ اپنی آزادی و عزت کو برقرار رکھیں یا پیروں کے تلے پامال ہونے دیں۔"

(۱۴)

۱۹۱۳ء سے امراض کے پے در پے حملوں اور خصوصاً فالج کے دوروں نے ان کو بہت ہی ناتواں اور مضمحل بنا دیا تھا لیکن ۱۹۱۵ء تک جب تک کہ وہ بالکل ہی مجبور و معذور نہ ہو گئے اپنی زبردست قابلیت، مضبوط کریکٹر اور اعلیٰ قوتِ ارادی سے قوم کی سیاسی و تعلیمی رہنمائی کرتے رہے۔ اور اس ہیجان و جوشش اور اضطراب

و مایوسی کے سالوں میں ان کے مشورے قوم کے لئے شمعِ ہدایت اور ان کی ذات باعث تسکین و سکون تھی وہ اپنی خرابیٔ صحت کے باعث قومی مجالس میں بہت ہی کم شریک ہوتے تھے لیکن ان کا گھر بجائے خود ایک مجلسِ شوریٰ بن گیا تھا اور دُور دُور سے قوم کے سربرآوردہ اصحاب مشوروں اور تبادلۂ خیالات کے لئے آتے رہتے تھے۔ ان کی صداقت پر گورنمنٹ کو بھی کامل اعتماد تھا اور اعلیٰ حکّام کھلے دل سے ان کے ساتھ مسلمانوں کے معاملات میں گفتگوئیں کرتے تھے چنانچہ اس آخری زمانہ میں ہز آنر سر جیمس مسٹن لفٹنٹ گورنر اور سر (موید الملک) سید علی امام کے سی ایس آئی لا ممبر گورنمنٹ آف انڈیا کی آمد بھی ان ہی اغراض پر مشتمل تھی۔

ان کے پاس ہر صبح ڈاک کا ایک انبار ہوتا تھا اور وہ فرداً فرداً جب تک کہ ہاتھوں میں طاقتِ تحریر رہی اپنے ہی قلم سے جواب لکھتے رہتے تھے۔

اس زمانہ میں بعض نہایت با اثر اور بارعب ہستیاں میدانِ عمل میں آئیں جن کی پالیسیاں خاص اغراض اور خاص نقطۂ نظر پر مبنی تھیں لیکن نواب وقار الملک کی شخصیت کبھی کسی سے مرعوب و متاثر نہ ہوئی۔ انھوں نے اُسی رائے اور خیال کا اظہار کیا جس کو قوم کے لئے مفید سمجھا اور اُن اُمور سے آزادی کے ساتھ اختلاف کیا جو اِن کے نزدیک قوم کے لئے مضر یا حمیّتِ اسلامی کے برخلاف تھے۔

وہ کبھی جوش و جذبات سے مغلوب ہو کر کام نہیں کرتے تھے بلکہ جذبات پر غالب آکر اور معاملہ پر غور کر کے مقابلہ کے لئے تیار ہوتے تھے۔ وہ سخت سے سخت

پیچیدہ معاملات میں اپنے اعلیٰ اصول سے ایک انچ بھی ہٹنا گوارا نہ کرتے تھے خواہ کچھ ہی نتیجہ اور انجام ہو۔

ان کی کامیابی کا راز سیاسی عیاری، زمانہ سازی، فصاحت و بلاغت، شیریں سخنی و خوش بیانی میں نہ تھا۔ بلکہ استقلال و اعتدال، مضبوطی دلائل، وقار اور صبر و سکون اور اپنے ایمان و صداقت پر اعتماد میں مضمر تھا۔

ان کی زندگی محرری سے معتمدی تک نہایت سادہ تھی۔ ترفع اور شان و شوکت کا شائبہ تک نہ تھا وہ عزیزوں اور دوستوں کے ساتھ خواہ غریب ہوں یا امیر یکساں سلوک کرتے تھے اور کبھی کسی غریب کو ان کے پاس ان کے برتاؤ سے اپنی غریبانہ حالت کا احساس نہیں ہوا پنشن لینے کے بعد باوجودیکہ وہ قصبہ سے باہر پرفضا کوٹھی اور محل تعمیر کرا سکتے تھے لیکن انھوں نے محلہ کی گنجان آبادی میں اپنے غریب عزیزوں اور اہل وطن کے ساتھ رہنے کو ترجیح دی اور ہمیشہ ان کے دکھ درد اور خوشی و مسرت میں شریک رہے۔

ہمدردی و فیاضی ان کا خمیر فطرت تھی اور اسی سبب سے حیدرآباد کے زمانہ میں بھی وہ کبھی آسودہ حالی سے زندگی بسر نہ کر سکے۔ پنشن کے بعد بھی اعزا اور غرباء کی امداد میں دو ڈھائی سو روپیہ ماہانہ معینہ رقم کے علاوہ اور بھی بقدر استطاعت سلوک کرتے رہتے تھے لیکن اس سلوک میں یہ ناممکن تھا کہ شرعی مدارج سلوک کو نظر انداز کردیں۔

وہ زمیندار تھے اور زمینداری میں کاشتکاروں کے ساتھ جو آئے دن جھگڑے کرنے پڑتے ہیں ان کو کچھ زمیندار ہی خوب جانتے ہیں لیکن ان کا زمیندارانہ تعلق ایک مثال تھا۔

کاشتکاروں سے ان کی ہمدردی ضرب المثل تھی اور وہ ہمیشہ رعایت، مساحمت اور فیاضی کا برتاؤ کرتے تھے خراب فصلوں اور خراب موسموں میں بسا اوقات لگان ہی معاف نہ کرتے تھے بلکہ ان کو مدد دیتے تھے اور قصبہ میں ان کا گھر اپنے کاشتکاروں کے لئے مہمان سرا تھا۔

وہ حقوق ادا کرنے میں امکانی عجلت سے کام لیتے تھے حیدرآباد میں جب ان کو چار سال کی جن میں وہ امیر کبیر کی ناراضی کے باعث علٰحدہ رہتے تھے پوری تنخواہ دی گئی تو اسی وقت انھوں نے پہلی بیوی کا مہر ادا کر دیا، پنشن کے بعد جب دوسرا عقد کیا اور جب ان کے انتقال کے بعد تیسرے عقد کی نوبت آئی تو انھوں نے حیدرآباد کا مکان فروخت کر کے ذوی الحقوق کے کل حقوق ادا کر دیئے اور محجوب الارث ورثار کو بھی صلۂ رحم سے محروم نہیں رکھا۔

وہ اگرچہ تعلیم جدید کے مناد اور اس کی اشاعت میں سرگرم کارکن تھے لیکن عقائد میں راسخ اور اعمال مذہب کے سخت پابند تھے اور تمام مسلمانوں کو اصلی مذہبی زندگی میں دیکھنا چاہتے تھے اور اسی لئے انھوں نے کالج میں مذہبی تربیت و تعلیم و تربیت پر بہت زیادہ زور دیا تھا اور جامعۂ اسلامیہ کی اسکیم کا سب سے بڑا منشا یہی تھا کہ مسلمانوں میں اصلی زندگی پیدا ہو۔ اس اسکیم میں ایک موقع پر مسلمانوں کی اخلاق و اعمال مذہب سے بیگانگی و بے پروائی کا تذکرہ کرتے ہوئے تحریر کیا ہے کہ:۔

"یہ مصیبت اور اسی قسم کی اور بہت سی مصیبتیں ہیں جن کی وجہ سے انسان ہر ایک قسم کی اصلی ترقیات سے بالکل محروم ہوتے چلے جاتے ہیں۔

انسداد کے لئے قوم کو یوں توجہ دلائی کہ :-

" بدمزاج سے بدمزاج حاکم بھی زیادہ عرصہ تک اپنی بدمزاجی پر قائم نہیں رہ سکتا۔ اگر رعایا اپنی آزادی کی حفاظت اعتدال و استقلال کے ساتھ کرتی رہے۔ اب جو معاملات کانپور کے متعلق مسلمانانِ صوبہ متحدہ کے سامنے ہیں یہ ایک ایسا موقع ہے کہ اگر ہم نے اس کو بغیر کافی توجہ کے ہاتھ سے جانے دیا تو ایک ٹائلر نہیں آئندہ ہم کو توقع رکھنی چاہئے کہ ہر ایک سب انسپکٹر ہمارے لئے ٹائلر ثابت ہوگا۔ اگر اس وقت ہم نے اعتدال و استقلال سے کام لیا تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ کوئی بڑے سے بڑا حاکم بھی دفعتہً ہمارے جذبات کے خلاف کارروائی کرنے میں بہت زیادہ احتیاط برتے گا اور اب ہمارے ہاتھ میں ہے کہ اپنی آزادی و عزت کو برقرار رکھیں یا پیروں کے تلے پامال ہونے دیں "

(۱۴)

سنہ ۱۹۱۳ء سے امراض کے پے در پے حملوں اور خصوصاً فالج کے دوروں نے ان کو بہت ہی ناتواں اور مضمحل بنا دیا تھا لیکن سنہ ۱۹۱۵ء تک جب تک کہ وہ بالکل ہی مجبور و معذور نہ ہو گئے اپنی زبردست قابلیت، مضبوط کریکٹر اور اعلیٰ قوتِ ارادی سے قوم کی سیاسی و تعلیمی رہنمائی کرتے رہے۔ اور اس ہیجان و جوشش اور اضطراب

و مایوسی کے سالوں میں ان کے مشورے قوم کے لئے شمع ہدایت اور ان کی ذات باعث تسکین و سکون تھی وہ اپنی خرابی صحت کے باعث قومی مجالس میں بہت ہی کم شریک ہوتے تھے لیکن ان کا گھر بجائے خود ایک مجلسِ شوریٰ بن گیا تھا اور دُور دُور سے قوم کے سربرآوردہ اصحاب مشوروں اور تبادلۂ خیالات کے لئے آتے رہتے تھے۔ ان کی صداقت پر گورنمنٹ کو بھی کامل اعتماد تھا اور اعلیٰ حکام کھلے دل سے ان کے ساتھ مسلمانوں کے معاملات میں گفتگوئیں کرتے تھے چنانچہ اس آخری زمانہ میں آنر سر جیمس مسٹن لفٹننٹ گورنر اور سر (موید الملک) سید علی امام کے سی ایس آئی لا ممبر گورنمنٹ آف انڈیا کی آمد بھی ان ہی اغراض پر مشتمل تھی۔

ان کے پاس ہر صبح ڈاک کا ایک انبار ہوتا تھا اور وہ فرداً فرداً جب تک کہ ہاتھوں میں طاقتِ تحریر رہی اپنے ہی قلم سے جواب لکھتے رہتے تھے۔

اس زمانہ میں بعض نہایت با اثر اور بارعب ہستیاں میدانِ عمل میں آئیں جن کی پالیسیاں خاص اغراض اور خاص نقطۂ نظر پر مبنی تھیں لیکن نواب وقار الملک کی شخصیت کبھی کسی سے مرعوب و متاثر نہ ہوئی۔ انھوں نے اُسی رائے اور خیال کا اظہار کیا جس کو قوم کے لئے مفید سمجھا اور اُن اُمور سے آزادی کے ساتھ اختلاف کیا جو ان کے نزدیک قوم کے لئے مضر یا حمیتِ اسلامی کے برخلاف تھے۔

وہ کبھی جوش و جذبات سے مغلوب ہو کر کام نہیں کرتے تھے بلکہ جذبات پر غالب آکر اور معاملہ پر غور کر کے مقابلہ کے لئے تیار ہوتے تھے۔ وہ سخت سے سخت

پیچیدہ معاملات میں اپنے اعلیٰ اصول سے ایک انچ بھی ہٹنا گوارا نہ کرتے تھے خواہ کچھ ہی نتیجہ اور انجام ہو۔

ان کی کامیابی کا راز سیاسی عیاری، زمانہ سازی، فصاحت و بلاغت، شیریں سخنی و خوش بیانی میں نہ تھا۔ بلکہ استقلال و اعتدال، مضبوطی دلائل، وقار اور صبر و سکون اور اپنے ایمان و صداقت پر اعتماد میں مضمر تھا۔

ان کی زندگی محرری سے معتمدی تک نہایت سادہ تھی۔ ترفع اور شان و شوکت کا شائبہ تک نہ تھا وہ عزیزوں اور دوستوں کے ساتھ خواہ غریب ہوں یا امیر یکساں سلوک کرتے تھے اور کبھی کسی غریب کو ان کے پاس ان کے برتاؤ سے اپنی غریبانہ حالت کا احساس نہیں ہوا پنشن لینے کے بعد باوجود یکہ وہ قصبہ سے باہر پرفضا کوٹھی اور محل تعمیر کرا سکتے تھے لیکن انھوں نے محلہ کی گنجان آبادی میں اپنے غریب عزیزوں اور اہل وطن کے ساتھ رہنے کو ترجیح دی اور ہمیشہ ان کے دُکھ درد اور خوشی و مسرت میں شریک رہے۔

ہمدردی و فیاضی ان کا خمیر فطرت تھی اور اسی سبب سے حیدرآباد کے زمانہ میں بھی وہ کبھی آسودہ حالی سے زندگی بسر نہ کر سکے۔ پنشن کے بعد بھی اعزا اور غرباء کی امداد میں دو ڈھائی سو روپیہ ماہانہ معینہ رقم کے علاوہ اور بھی بقدر استطاعت سلوک کرتے رہتے تھے لیکن اس سلوک میں یہ ناممکن تھا کہ شرعی مدارج سلوک کو نظرانداز کردیں۔

وہ زمیندار تھے اور زمینداری میں کاشتکاروں کے ساتھ جو آئے دن جھگڑے کرنے پڑتے ہیں ان کو کچھ زمیندار ہی خوب جانتے ہیں لیکن ان کا زمیندارانہ تعلق ایک مثال تھا۔

کاشتکاروں سے ان کی ہمدردی ضرب المثل تھی اور وہ ہمیشہ رعایت، مساحمت اور فیاضی کا برتاؤ کرتے تھے۔ خراب فصلوں اور خراب موسموں میں بسا اوقات لگان ہی معاف نہ کرتے تھے بلکہ ان کو مدد دیتے تھے اور قصبہ میں ان کا گھر اپنے کاشتکاروں کے لئے مہمان سرا تھا۔

وہ حقوق ادا کرنے میں امکانی عجلت سے کام لیتے تھے حیدرآباد میں جب ان کو چار سال کی جن میں وہ امیر کبیر کی ناراضی کے باعث علٰحدہ رہتے تھے پوری تنخواہ دی گئی تو اسی وقت انھوں نے پہلی بیوی کا مہر ادا کر دیا، پنشن کے بعد جب دوسرا عقد کیا اور جب ان کے انتقال کے بعد تیسرے عقد کی نوبت آئی تو انھوں نے حیدرآباد کا مکان فروخت کر کے ذوی الحقوق کے کل حقوق ادا کر دیئے اور محجوب الارث ورثار کو بھی صلۂ رحم سے محروم نہیں رکھا۔

وہ اگرچہ تعلیم جدید کے مناد اور اس کی اشاعت میں سرگرم کارکن تھے لیکن عقائد میں راسخ اور اعمال مذہب کے سخت پابند تھے اور تمام مسلمانوں کو اصلی مذہبی زندگی میں دیکھنا چاہتے تھے اور اسی لئے اُنھوں نے کالج میں مذہبی تربیت و تعلیم تربیت پر بہت زیادہ زور دیا تھا اور جامعہ اسلامیہ کی اسکیم کا سب سے بڑا منشا یہی تھا کہ مسلمانوں میں اصلی زندگی پیدا ہو۔ اس اسکیم میں ایک موقع پر مسلمانوں کی اخلاق و اعمال مذہب سے بیگانگی و بے پروائی کا تذکرہ کرتے ہوئے تحریر کیا ہے کہ:-

"یہ معصیت اور اسی قسم کی اور بہت سی معصیتیں ہیں جن کی وجہ سے انعمان ہر ایک قسم کی اصلی ترقیات سے بالکل محروم ہوتے چلے جاتے ہیں۔

اور جن کا کوئی علاج اس کے سوا نہیں ہے کہ ہمارے علماء کی تعلیم اور فیضِ صحبت مسلمانوں کو قرآنِ پاک کی ہدایتوں کی طرف راغب کیا جائے تسخیرِ ممالک سے قطع نظر کرو۔ یہ ہنڈتی پھرتی چھاؤنی ہے۔ انسان کی اصل ترقی اس کے اخلاق کی ترقی ہے۔

"پیغمبرِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے مکارمِ اخلاق ہی کی تکمیل کو اپنی بعثت کی علتِ غائی قرار دیا ہے۔ اب اسلام کی تاریخ کو اٹھا کر دیکھو کہ مسلمانوں نے اپنے مکارمِ اخلاق میں کیسی اعلیٰ درجہ کی ترقی کی تھی جس کی بدولت ایک جاہل شخص سے بھی اُن محاسن کا ظہور ہوتا ہے جس کی بڑے بڑے شائستہ عالموں اور سائنس کے ماہروں اور فلاسفروں سے بھی توقع نہیں کی جا سکتی افسوس ہے کہ ہماری قوم سے یہ قوتیں سلب ہو گئی ہیں اور سلب ہوتی چلی جاتی ہیں اور انہی مردہ قوتوں کو زندہ کرنے کی آج سب سے زیادہ ضرورت ہے اور جب قوم میں یہ زندگی پیدا ہو جاتی ہے تو سمجھ لینا چاہئے کہ قوم زندہ ہو گئی ہو رہے چند امیدوارانِ ملازمت کو آج جس قسم کی تعلیم دی جا رہی ہے اس سے قوم میں وہ زندگی عود نہیں کر سکتی جس کی ضرورت ہے۔"

وہ اسلامی مدارس عربیہ کے بڑے حامی تھے انھوں نے حیدرآباد میں اپنے اقتدار کے زمانہ میں جس طرح کالج کو فائدہ پہنچایا اسی طرح مدرسۂ دیوبند کا سالانہ بھی مقرر کرایا۔ غرض پورے پچاس سال اُنھوں نے صداقت و ایثار کے ساتھ قوم کی خدمت

میں بسر کئے اور جس وقت ان کی حالت اس نوبت پر آگئی کہ کام کرنے سے معذور ہو گئے تو وہ محض احساس فرض کے لحاظ سے کالج اور لیگ کی ممبری سے مستعفی ہو گئے لیکن ان کی عظیم الشان خدمات کے لحاظ سے ٹرسٹیوں اور لیگ کے ممبروں نے گوارا نہ کیا کہ زندگی ہی میں ان کا تعلق کالج اور لیگ سے منقطع ہو جائے اس لئے ٹرسٹیوں نے ان کو کالج کا وزیٹر بنایا جو ایک قسم کا اعزازی عہدہ تھا۔ اور لیگ نے وائس پریزیڈنٹ منتخب کر کے ان کا تعلق قائم رکھا۔

۱۹۱۶ء میں ان کی حالت بہت نازک ہو گئی تھی تکلیفات بہت بڑھ گئی تھیں۔ نشست و برخاست سے بھی معذور ہو گئے تھے اور آخر میں ہوش و حواس بھی باقی نہیں رہے تھے۔ انھیں تکلیفوں میں تقریباً ایک سال گزار کر ۲ جنوری ۱۹۱۷ء مطابق ۸ ربیع الثانی ۱۳۳۵ھ دوشنبہ کے دن رات کے ایک بجے ان کی روح داعیٔ اجل کی صدا پر لبیک کہتی ہوئی جسم خاکی کو چھوڑ کر فردوس بریں میں راحت گزیں ہو گئی۔

إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ

صبح کو ان کی لاش آبائی قبرستان میں اعزا و اقربا کے پہلو بہ پہلو دفن کی گئی۔

(۱۵)

اس واقعہ کی خبر سے جو اگرچہ غیر متوقع نہ رہی تھی تاہم اس کے سنتے ہی تمام قوم کے دلوں میں ایک شفیق و عزیز لیڈر اور خالص و مخلص رہبر کی دائمی جدائی سے رنج و الم کے

جذبات موجزن ہوگئے۔ کالج کے ٹرسٹیوں اور طالب علموں کی خواہش و تمنا تھی کہ اس ساکت جسم کو جو ۵۰ سال تک قومی خدمات میں برابر متحرک رہا کالج کے احاطہ میں اس کے رفقاء کے ساتھ دفن کیا جائے لیکن وقت گزر چکا تھا اور تدفین ہو چکی تھی۔

ہر گوشۂ ملک سے ان کے فرزند مشتاق احمد (صاحب بی اے بیرسٹر ایٹ لا) کو تعزیت کے پیغام موصول ہوئے جن میں نہایت گہرے رنج و افسوس کا اظہار تھا۔ ان پیغاما تعزیت میں ہز آنر سر جیمس میسٹن کے یہ الفاظ جو انھوں نے اپنے پرائیویٹ خطِ تعزیت میں لکھے تھے کہ "ان کی زندگی شان دار تھی اور انھوں نے اپنی قوم کے لئے ایک عظیم جنگ کی اور اچھی عمر پاکر اور پوری شہرت حاصل کرکے اب انتقال کیا" اس امر کا ثبوت ہیں کہ گورنمنٹ سرکل میں بھی ان کی صداقت کا کس قدر زبردست اثر تھا سچ ہے

الحق یعلو ولا یعلیٰ

اخبارات میں بکثرت مضامین شائع ہوئے جن میں ان کی قومی خدمات اور محاسن و فضائل کا تذکرہ تھا۔ صاحبزادہ آفتاب احمد خاں بیرسٹر (ممبر انڈیا کونسل و وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی) نے ایک زبردست مضمون میں ان کے قابل مثال اخلاق اور خدمات پر تبصرہ کیا۔

ان تمام مضامین میں مولوی سید سلیمان صاحب (ندوی) اڈیٹر معارف کا ایک مختصر سا جامع مضمون جو معارف میں شائع ہوا تھا اس اندازہ کے لئے کہ نواب صاحب کا اپنی قوم پر کیسا زبردست اثر تھا ہم ذیل میں نقل کرتے ہیں۔

قافلہ کا آخری مسافر

علم والے علم کا دریا بہا کر چل دیئے
واعظانِ قوم سوتوں کو جگا کر چل دیئے

کچھ سخنور تھے کہ سحر اپنا دکھا کر چل دیئے
کچھ مسیحا تھے کہ مُردوں کو جلا کر چل دیئے

نواب محسن الملک کی وفات پر ہم نے تدبیر و سیاست کا ماتم کیا، مولانا نذیر احمد کے مرنے پر سحر نگاری اور بزم آرائی کا مرثیہ پڑھا، مولانا شبلی کی موت پر ہم نے علم کے فقدان پر نوحہ کیا مولانا حالی کو رخصت کرتے ہوئے ہم نے سخنوری اور دقیقہ سنجی پر نالہ کیا، لیکن نواب وقار الملک کی رحلت پر ہم قوم کا ماتم کرتے ہیں، اور اولوالعزمانہ اخلاق کی گم شدگی پر فریاد!

یہ ہستی گرانمایہ جس نے ہماری دنیا کو ۲۸ جنوری ۱۹۱۷ء میں الوداع کہا ہمارے کارفرما قافلہ کا آخری مسافر تھا اس کے بعد وہ دَور جو انقلاب ہند کے بعد شروع ہوا تھا ختم ہو گیا وہ دَور جو انگریزی کالجوں کی کائنات نہیں بلکہ بوریا نشیں مدارس کا نتیجہ تھی منتہی ہو گیا۔ وہ دَور جو قدیم تعلیم اور قدیم اخلاق کے نمونوں کو پیش کرتا تھا منقطع ہو گیا! یعنی آئندہ ہماری قسمت کے مالک عربی مدارس کے شعلے نہ ہوں گے بلکہ انگریزی درس گاہوں کے ہیٹ اور جبے ہوں گے۔ اب مشرق، مشرق کی قومیت پر حکومت نہیں کرے گا بلکہ مغرب! اب لیڈری اور رہبری جمہور کے لئے جوش دل اور اخلاص عمل ضروری نہ ہوگا بلکہ صرف ایک کامیاب عہد اور ایک عمدہ سوٹ فیا ویلاہ علی فقید الاسلام و یا خیباہ للمسلمین!

مسلم لیگ، مسلم ایجوکیشنل کانفرنس اور کالج کے ٹرسٹیوں نے اپنے اجلاسوں میں تعزیتی

رزولیوشن پاس کئے اور ان کی تعلیمی خدمات اور اس جدوجہد کا جو انھوں نے قوم کے حقوق و مقاصد کے حصول میں کی تھی اعتراف کیا۔

ان کی زندگی، ان کا طریق عمل، ان کا طرز کارروائی اور ان کا کریکٹر قوم کے نوجوانوں کے لئے ایک سبق تھا چنانچہ (مولانا) شوکت علی اپنے ایک خط مورخہ ۴ فروری ۱۹۱۶ء میں لکھتے ہیں کہ: "ہم لوگوں کی مادہ پرست اور فوق البشرک زندگیوں میں جو کچھ انقلاب اب نظر آتا ہے اُس کو پیدا کرنے والی نواب صاحب مرحوم کی سادہ اسلامی زندگی کی مثال تھی.... جو احسانات نواب صاحب مرحوم نے ہم نوجوان مسلمانوں پر کئے ہیں اس کا اجر تو خدا سے ان کو ضرور ملے گا۔ ان کی زندگی نے اسلامی عظمت کا سکہ ہمارے دلوں میں بٹھایا اور ہم کو دکھایا کہ اس بیسویں صدی میں بھی مسلمان آسانی کے ساتھ دینی اور اسلامی زندگی بسر کر کے قوم و ملک کی خدمت کر سکتا ہے"۔

غرض اس زمانہ کے مشاہیر میں خداوند تعالیٰ نے یہ شرف انھیں کے لئے مخصوص کیا تھا کہ قوم کے ہر طبقہ میں اور ہر عقیدہ اور خیال کے گروہ میں ان کی یکساں عزت تھی اور آخر وقت تک قایم رہی۔ امید ہے کہ ان کی شاندار زندگی کے کارنامے بہت سے نوجوانوں کے دلوں میں صداقت و ایثار کے ساتھ قومی بھلائی اور ملکی خدمت کا حوصلہ پیدا کریں گے۔

محمد امین زبیری مارہروی

۱۴ اکتوبر ۱۹۲۵ء